اور ان کی علمی و دینی، اصلاحی و تبلیغی، قومی و ملی اور تصنیفی سرگرمیوں کی داستان ہے، اردو کے دونوں حصوں پر ان صفحات میں مفصل تبصرہ کیا جا چکا ہے، عربی ترجمہ کی خاص اور نئی چیز اس کا مقدمہ ہے جو ایک عرب فاضل اور مشہور و ممتاز ادیب شیخ علی طنطاوی کے قلم سے ہے، اس میں پہلے مولانا کی موروثی عظمت، خاندانی نجابت، ذاتی فضل و کمال اور علمی، دینی اور تاریخی حیثیت سے ہندوستان کی اہمیت دکھائی ہے، اور اس کتاب کی بعض نمایاں خصوصیات بتائی ہیں، پھر مصنف سے اپنی واقفیت اور تعارف کے ضمن میں ان کی مشہور و مقبول تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا ذکر کیا ہے، اصلاح و دعوت کی طرح ادب اسلامی سے مولانا کی دلچسپی پر گفتگو کرتے ہوئے رابطہ ادب اسلامی کو قائم کرنے اور ان کی تصنیف "روائع اقبال" کا تذکرہ کیا ہے عربی، اردو اور انگریزی میں مہارت اور فارسی سے واقفیت، ان کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت اور ندوۃ العلماء کے بعض امتیازات کو واضح کیا ہے، آخر میں مولانا کی سیرت و شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف بیان کیے ہیں، اس سلسلہ میں ان کے زہد، تواضع، زمانہ کے حالات و مسائل سے باخبری، دین و دنیا کی جامعیت، اسلام کے محافظ علماء و تلامذہ کی جماعت تیار کرنے اور ان کے اصول دعوت و طریقۂ اصلاح کی خوبی و برتری وغیرہ کا ذکر کیا ہے، مقدمہ سے عالم اسلام میں مولانا کی مقبولیت اور علمائے عرب کی نگاہ میں ان کی قدر و عظمت کا ضرور پتہ چلتا ہے، مگر بقول مقدمہ نگار جو شخص شہرت و عظمت کے بام عروج پر پہونچ گیا ہو، نہ وہ اس طرح کے رسمی تعارف کا محتاج ہے، اور نہ اس کی تصنیف کو کسی مقدمہ و تقریظ کی ضرورت ہے

گ - بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

سلیس و شگفتہ ترجمہ کے لیے نوجوان مترجم اور عمدہ و خوبصورت طباعت کے لیے ناشر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"ض"

جلد ۱۴۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۸ء عدد ۴

## مضامین

# شذرات

تقسیم کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ جنون اور لسانی تعصب کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی اس کی لپیٹ میں اردو زبان بھی آگئی تھی مگر اب اس کی شدت میں کمی ہوگئی ہے، اور اردو کے بارے میں صورت حال بدل رہی ہے، ہندی والوں کے دل میں بھی اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہونے لگا ہے، مدھیہ پردیش میں حال ہی میں ہندی کے ادیبوں اور دانشوروں نے اردو کی حمایت میں بیان دیا ہے اور لکھنؤ میں جن وادی لیکھک سنگھ کی اترپردیش شاخ کے ایک اجلاس میں جو ۲۷ر فروری کو گنگا پرشاد میموریل ہال میں ہوا، اردو کو یو. پی کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی قرارداد منظور کی گئی، اس اجلاس میں اردو کے ادیب و شاعر بھی موجود تھے، مگر ہندی کے ادیبوں کی اکثریت تھی، ان کی جانب سے یہ مطالبہ ایک اچھی علامت اور اردو کے لیے فال نیک ہے، ایسی فضا میں گذشتہ ماہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی کانفرنس کا یہ فیصلہ کہ ہندی والوں سے اور زیادہ قربت حاصل کی جائے بہت مناسب اور دانشمندانہ ہے، اس پر عمل کرنے کی صورت پر بھی غور کرنا چاہیے۔

---

آزادی سے پہلے یہ جھگڑا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو؟ اس کے نتیجہ میں اردو اور ہندی میں کشمکش پیدا ہوگئی تھی، مگر آزادی کے بعد معمولی اور نام ہی کی اکثریت سے سہی جب ہندی کو ملک کی سرکاری زبان تسلیم کرلیا گیا تو مولانا ابوالکلام آزاد کے بقول "اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب ہوگیا، اور اردو کی بات رقیب کی حیثیت سے ختم ہوگئی، اب ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے، فرض ہے کہ اسے مانے .... اب یہ سوال اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کون سی ہوگی ہندی کو جو جگہ ملنی تھی وہ اسے مل گئی، اب ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے، لیکن اس کے ساتھ اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیے" لیکن ملک کو آزاد ہوئے چالیس برس گذر گئے مگر افسوس ہے کہ اردو کو اس کا جائز حق اور اصلی جگہ نہیں مل سکی۔

---



ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے منوانے کی کوشش ایک عرصہ سے جاری ہے، لیکن بہار کے سوا اور دوسری ریاستیں اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اب تک یہ کام نہیں کرسکی ہیں ان کو جتنا جلد اس کا احساس ہوجائے اچھا ہے کہ سیاسی مصلحت کی وجہ سے حق و انصاف کی آواز کو دبانا جمہوریت کا گلا گھونٹنا ہے انجمن ترقی اردو ہند کی کانفرنس نے پھر ایک بار اپنے مطالبہ کو دہرایا ہے، دیکھنا ہے آنے والے انتخابات کے پیش نظر سیاسی پارٹیاں اپنے منشور میں اس مطالبہ کو کس حد تک جگہ دیتی ہیں۔

---

نظام تعلیم میں سہ لسانی فارمولے میں اردو کو جگہ دینے کا سوال بھی ہے جواب تک طرح طرح کے حیلوں کا شکار ہوتا رہا ہے خصوصاً اترپردیش میں اس کے لیے متعدد بار سعی و کوشش کی گئی مگر رائیگاں گئی، اس سے حکومت کی بدنیتی اور اردو کو نظر انداز کرنے کی پالیسی کا اندازہ ہوتا ہے، تازہ اطلاع کے مطابق پھر اردو کو سہ لسانی فارمولے میں شامل نہ کرکے اترپردیش کی حکومت نے اردو والوں کے کرب و بے چینی میں اضافہ کردیا ہے، جمہوریت میں ووٹوں کی بڑی طاقت ہوتی ہے، عجب نہیں کہ وقت آنے پر اردو والے اس طاقت سے کام لے کر مقصد برآری کرلیں۔

---

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کی جانب سے ۲۲ر تا ۲۶ر مارچ کو پٹنہ میں ایک سیمینار ہوا اس کا خاص موضوع تو "ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ سے متعلق عربی و فارسی مخطوطات" تھا، لیکن اس کے کئی جلسوں میں درسی کتابوں کے مواد کا بھی جائزہ لیا گیا، اور اسلام خصوصاً مسلم سلاطین ہند کے بارہ میں دل آزار اور گمراہ کن اسباق کی نشاندہی کی گئی، سیمینار میں اکثر ریاستوں کے نمایندے شریک تھے اور انھوں نے اپنی ریاست کے اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں پر مضامین پڑھے جن پر مفید بحثیں ہوئیں اور آخر میں تجویزیں بھی منظور کی گئیں، جلگاؤں کے نمایندے پروفیسر اکبر رحمانی مدیر رسالہ آموزگار کو اس مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی اور وہ راقم کا خیال دریافت کرنے کے لیے میری رہائش گاہ پر

تشریف لائے اور اسے ٹیپ بھی کیا۔

---

اس موضوع پر بارہا حکومت کی توجہ مبذول کرائی جاچکی ہے، کمیٹیوں کی سفارشات بھی اس کے سامنے ہیں لیکن مسئلہ جوں کا توں ہے، فرقہ وارانہ منافرت کے جراثیم دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، اس لیے دماغ ہی میں ان کی مدافعت کا بھی سامان ہونا چاہیے، لیکن قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے بلند دعووں کے باوجود بدستور زہر پھیلتا جارہا ہے، اگر ریاستی حکومتیں اپنی ٹکسٹ بک کمیٹیوں کو ہدایت کردیں کہ کم از کم زبان وادب اور تاریخ کی ساری کتابیں طباعت سے پہلے اسلامیات اور تاریخ کے واقف کار ماہرین کو دکھالی جائیں تو یہ معاملہ بڑی حد تک حل ہوسکتا ہے، سیمینار کے داعی ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

---

۱۸ ر ۱۹ ر مارچ کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی یادگار میں ایک سیمینار مدنی ہال نئی دہلی میں ہوا، اس میں مولانا کی سیرت و شخصیت، ان کے دینی و علمی کارناموں اور ملی و سیاسی خدمات پر سیر حاصل مضامین پڑھے گئے، اس کا افتتاح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے صدارتی خطبہ سے ہوا، دوسرے اجلاس کا آغاز پروفیسر خلیق احمد نظامی کے پرمغز مقالہ سے ہوا، اسی اجلاس میں مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی ڈیٹر دارالعلوم، جناب دشوانا تھ طاؤس اور راقم نے بھی مقالے پڑھے،

---

دوسرے روز مولانا قاضی زین العابدین، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اور پروفیسر تنویر احمد علوی وغیرہ کے مقالے ہوئے، اس کے داعی مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علمائے ہند اور کنوینر ڈاکٹر رشید الوحیدی استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ تھے، مولانا اسعد مدنی کی مساعی جمیلہ سے دفتر جمعیۃ علماء کی شاندار عمارتیں اور وسیع مدنی ہال کے علاوہ مسجد عبدالنبی کی بھی از سر نو تعمیر ہوئی ہے جو ان کی قوت کار کا ثبوت ہے۔

---

ہندوستان کے عربی مدارس کو ملک کے تعلیمی نظام سے قریب لانے کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی میں ۲۲ر مارچ کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن دہلی کے وائس چیرمین اور لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایس۔ پی نگیندر کی موجودگی میں ایک مجلس مذاکرہ ہوئی جس میں مولانا ابوالعرفان ندوی نے بعض مفید باتوں کی جانب توجہ دلائی نظر ثانیہ پر مجلس کا خاتمہ ہوا۔

---



# مقالات

## اندلس کا اسلامی تمدن مستشرقین کی نظر میں

از ڈاکٹر مصطفیٰ الشکعۃ صدر دراسات علیا و بحث علمی جامعہ امارات عربیہ

ترجمہ: محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دارالمصنفین

(۴)

**مستشرق سیمونٹ اور ان کی کتاب المستعربون**

اس مضمون میں متعدد مستشرقین کا تذکرہ کیا جاچکا ہے جنھوں نے اسلامی ثقافت و تمدن اور مسلمانوں کی اہم شخصیتوں اور پرعظمت کارناموں کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے، اس ضمن میں پروفیسر ڈوزی کا ذکر بھی آیا تھا، اب ان کے ایک اور ہمنوا ہسپانوی مستشرق فرانسسکو جاویر سیمونٹ کے خیالات پر ان کی کتاب المستعربون کی روشنی میں بحث و گفتگو کی جائے گی۔

ان کی دو[2] کتابیں ہیں: گلوساریو[1]، جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی تھی، یہ اصلاً ان آئبری اور لاطینی الفاظ و کلمات پر مشتمل ایک لغت ہے، جو اندلس کے مسلمانوں میں رائج تھے، اور اس سے ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اندلسی مسلمان جس قدر لاطینی تہذیب پر اثر انداز ہوئے، اس سے زیادہ وہ خود اس سے متاثر تھے، ان کی دوسری کتاب المستعربون[2] ہے، جو ایک طویل مقدمہ کے علاوہ بیالیس[42] ابواب پر مشتمل اور سب و شتم اور کذب و افترا کا مجموعہ ہے۔

**المستعربون کی وجہ تسمیہ اور اس کی ابتداء**

اسلامی فتوحات کے بعد ہسپانیہ کے عیسائیوں کی بڑی تعداد ثقافت و

تمدن، زبان وادب اور طرزِ معاشرت وغیرہ میں عربوں کے نقشِ قدم پر چلنے لگی تھی، اس لیے ان کی ظاہری صورت وہیئت اور ان کے نام عربوں کے مانند ہوتے تھے یہاں تک کہ ان کی مذہبی زندگی اور دینی شعائر ورسوم پر بھی عربوں کی اس قدر گہری چھاپ ہوگئی تھی کہ ان کی نوعیت عام عیسائیوں سے جداگانہ معلوم ہوتی تھی، رفتہ رفتہ مسلمانوں سے اختلاط کے نتیجہ میں ان کا ایک طبقہ اسلام میں بھی داخل ہوا، علاوہ ازیں یہ لوگ عربی علوم وآداب اور مذہبی فنون سے بھی مکمل طور پر بہرہ ور ہوتے تھے، مستشرقین کے حلقہ میں یہی لوگ مستعرب کہلاتے ہیں، اور یہ خود عیسائیوں کی اصطلاح وایجاد ہے، گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب ہسپانیہ کے بعض حصوں پر لاطینی عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو جو عیسائی یہاں پہلے سے آباد تھے انھیں لاطینی عیسائیوں نے مستعرب کہنا شروع کردیا[1]، حالانکہ ان لوگوں میں سے بہت سے افراد نے اسلام قبول کرلیا تھا مگر ان کے ناموں میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی، جیسے بنی انجلینو، بنی شبریق، بنی لبق، اور بنی القبطرنہ وغیرہ[2]۔

**اسلامی ثقافت وتمدن کی اہمیت کا انکار**

سیمونٹ اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"عربوں نے اپنے زورِ بازو سے مصر وشام اور دوسرے مشرقی ملکوں کو مطیع تو ضرور کرلیا، مگر جن ملکوں میں پہلے سے نصرانی حکومتیں قائم تھیں ان میں وہ کوئی ثقافتی انقلاب نہ لاسکے، کیونکہ یہ ممالک خود ہی اعلیٰ اور ارفع تہذیبی اقدار کے حامل تھے، جب مشرق میں ان کا یہ حال تھا تو مغرب میں بھلا وہ کیا اثر انداز ہوسکتے تھے، جو براہ راست رومی ثقافت وتمدن کا وارث تھا"

مزید لکھتے ہیں:

---

۱؎ فجر الاندلس ص ۴۲۶ ۲؎ ایضاً ص ۴۳۱۔



"انسانی تاریخ میں اسلامی ثقافت وتمدن کا سب سے اہم کارنامہ عہد عباسی میں فلسفیانہ علوم کی نشوونما ہے، مگر یہ کارنامہ بھی اصلاً ان مسیحی راہبوں کا رہین منت ہے، جنھوں نے یونانی فلسفہ کو عربی زبان میں منتقل کیا"

یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے، مگر اس کا دائرۂ کار محض ترجمہ ہی تک محدود رہا ہے، جبکہ اس اثنا میں مسلمانوں نے خود بھی ترجمہ کا کام انجام دیا، اور علوم وفنون میں جدت واختراع بھی کی، اس سلسلہ میں مشہور فلسفی اور طبیب کندی کا نام سرفہرست ہے، جو خود ایک ماہر مترجم تھا اسے دنیا کی چار زبانوں پر غیر معمولی قدرت اور عبور حاصل تھا، علاوہ ازیں ابن فرحان اور فرزندانِ شاکر بھی اس عہد کے مترجم ہیں۔

پھر اس عہد میں فلسفہ کی نشوونما اور علوم وفنون کی وسعت میں دوسرے اہم سرچشموں سے بھی مدد لی گئی، چنانچہ عبداللہ بن مقفع اور دوسرے مترجمین نے فارسی زبان سے علوم وفنون کا بڑا ذخیرہ عربی میں ترجمہ کیا تھا، اسی طرح اس دور میں ہندوستانی ثقافت وتمدن کا سرمایہ بھی عربی میں منتقل کیا گیا۔

سیمونٹ نے ان مصادر کو نظر انداز کرنے کے علاوہ اس اہم اور بنیادی بات کو بھی فراموش کردیا ہے کہ علمی خدمت اور استفادہ کے پیش نظر اس علمی اور ادبی سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا تھا، مسلمانوں نے اس پر اسلامی ثقافت وتمدن کی بنیاد نہیں رکھی ہے۔

**مسلمان فاتحین کو مجروح کرنے کی کوشش**

سیمونٹ کی اس کتاب میں اسلامی فتوحات کا ذکر بھی ہے، مگر اس میں مسلمان فاتحین کے شجاعانہ اور دلیرانہ کارناموں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے، جبکہ انھوں نے صرف دو برس میں پورا جزیرہ آئیبریا فتح کرلیا، مگر سیمونٹ ان کی اولوالعزمی اور بہادری کا تذکرہ کرنے کے بجائے ہسپانیہ کے یہودیوں کا ذکر مبالغہ آرائی سے

کر کے ان ہی کو اسلامی فتوحات کا باعث قرار دیتے ہیں، اور مسلمان فاتحین کو متعصب اور ظالم گردانتے ہیں، انھوں نے یہ ہرزہ سرائی بھی کی ہے کہ مسلمانوں نے ہسپانوی باشندوں کی مذہبی آزادی سلب کر لی تھی، اور انھیں آزادیٔ رائے سے محروم کر دیا تھا، اور ان کے کلیساؤں کو تباہ و برباد بھی کیا۔

اسی ضمن میں انھوں نے بعض معاہدوں کا بھی ذکر کیا ہے، جیسے معاہدۂ عبدالعزیز بن موسیٰ، اور معاہدۂ طارق بن زیاد وغیرہ جن کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے، ان پر انھوں نے حسب ذیل تبصرہ کیا ہے:

"بالغرض یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ عرب سربراہوں اور فرماں رواؤں نے اس قسم کے معاہدے کیے تھے اور وہ مخلص بھی تھے، تاہم اس قدر رواداری پر مبنی معاہدوں پر عمل پیرا رہنا ان کے بس میں نہ تھا[1]"

اس بے بنیاد خیال کی تائید میں انھوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ عبدالعزیز بن موسیٰ نے اپنے والد کے ایک معاہدے کو چاک کر دیا تھا جو باشندگان کو نیبرا سے کیا گیا تھا، اور اس کی خلاف ورزی کر کے اس شہر اور اس کے مضافات میں غارت گری کی تھی، جبکہ اس معاہدہ کو چار برس سے بھی زیادہ نہیں گذرے تھے،

عبدالعزیز بن موسیٰ کے اس واقعہ کا تذکرہ ہمیں تاریخ اندلس کے کسی عربی ماخذ میں نہیں ملا، گو اس کی زد مسلمانوں پر پڑتی ہے، تاہم یہ بات مسلمان مورخین کی ثقاہت و دیانت داری کے خلاف ہے کہ وہ ایسے اہم اور غیر معمولی واقعہ کو نظر انداز کر دیں، پھر اس سلسلہ میں خود سیمونٹ کے بیان میں تضاد ہے، وہ اسی کتاب میں ایک جگہ اس کے بالکل برعکس یہ لکھتے ہیں کہ:

[1] المستعربون ص ۶۷.



"اسلامی حملہ کے وقت پادریوں اور مذہبی رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد خوف و دہشت سے بھاگ کھڑی ہوئی، مگر جب اس نے دیکھا کہ مسلمان کلیسا یا مذہبی اشخاص سے کوئی تعرض نہیں کرتے ہیں تو وہ پھر دوبارہ اپنی جگہوں پر لوٹ آئے[1]"

اور وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"کلیسائے ابیط الجامعہ خوب معمور رہتا تھا، حالانکہ پہلے وہ مختصر سا گرجا تھا، اس میں مختلف جگہوں کے منہدم ہونے والے کلیساؤں کی مقدس چیزیں بھی جمع کر دی گئی تھیں[2]، اسی طرح کلیسائے طلیطلہ بھی خوب آباد تھا، شیشلیا نام کا ایک جلیل القدر راہب اس کا منتظم تھا، اس کو ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ اس کے پیرو کار کیتھولک عقیدہ ہی کے پابند رہیں، جب کوئی کلیسا منہدم ہو جاتا تو یہ اسے تعمیر کراتا تھا، ابو الخطار اور صمیل بن حاتم[3] کے درمیان سخت جھڑپوں کے دوران بھی کلیساؤں کو کوئی ضرر نہیں پہونچا[4]"

ہمارے خیال میں سیمونٹ کی یہ پراگندہ خیالی اور تضاد بیانی دراصل اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اگر وہ ان کا مطالعہ کرتے تو انھیں خود معلوم ہو جاتا کہ اسلام نے نہ صرف مسلمانوں کو اہل کتاب کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی ہے، بلکہ ان کی عبادت گاہوں اور مقدس مقامات کی حفاظت کی تاکید بھی کی ہے۔

**مسلمانوں کی عدم رواداری کا تذکرہ**

کتاب کے تیسرے باب میں ہسپانیہ کے عیسائیوں پر مسلمانوں کی زیادتی اور بدسلوکی کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور اس کی چند مثالیں بھی دی گئی ہیں، جیسے کسی عیسائی کے چھینکنے پر مسلمانوں کا یَرْحَمُكَ اللہ کہہ کر دعا نہ کرنا، اور مسلمانوں کی طرح انھیں سلام نہ کرنا، اسی طرح عیسائیوں کو کنیت رکھنے کی اجازت نہ دینا وغیرہ[5]۔

[1] المستعربون ص ۱۲۲ [2] ایضاً ص ۲۱۱ [3] ایضاً ص ۲۰۷ [4] ایضاً ص ۲۱۱.

سیمونٹ نے اس اجتماعی معاشرتی بدسلوکی کا منبع اسلام کو قرار دیا ہے، حالانکہ یہ تو محض فقہا کا ایک اجتہادی مسئلہ ہے، اسلام نے مسلمانوں کو ذمیوں کے ساتھ جس قسم کے اچھے برتاؤ کا حکم دیا ہے اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان میں اور غیر مسلموں میں الفت و مودت اور یگانگت و اخلاص پیدا ہو، اس نے غیر مسلموں کو سلام و دعا کی ممانعت نہیں کی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ سیمونٹ اسی کے ساتھ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ مسلمان باوجودیکہ عیسائیوں کے ساتھ اس طرح کا ناروا اور ظالمانہ سلوک کرتے تھے، انھوں نے ان کے بعض ایام عید جیسے عید شعانین وغیرہ پر کوئی بندش عائد نہیں کی تھی، پھر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اور یہ امر مسیحی ثقافت و تمدن کی فضیلت و برتری کا ثبوت فراہم کرتا ہے[1]"۔

گو اس کا مقصد مسیحی ثقافت و تمدن کو برتر قرار دینا ہے، تاہم اسی سے ان کے اس مغالطہ آمیز بیان کی تردید بھی ہو جاتی ہے جو اوپر گذرا ہے، اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا برتاؤ ذمیوں کے ساتھ ظالمانہ نہ تھا۔

مسلمانوں کی یہ رواداری صرف عام لوگوں ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ اس میں فرماں روایانِ مملکت بھی شامل تھے، اسلامی مصادر کی تصریح کے مطابق عباسی خلیفہ مامون جزیرہ کے ایک سفر کے دوران کسی گرجا کے پاس فروکش تھا، اتفاق سے یہ عید شعانین کا موقع تھا، پادریوں نے خلیفہ کو شرکت کی دعوت دی، چنانچہ خلیفہ ان ہی کے ہمراہ گرجا میں داخل ہوا، اور اس تقریب میں شریک ہوا۔

اس باب میں سیمونٹ نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ کوئی عیسائی اگر اسلام قبول کر لینے کے

---

[1] المستعربین ص ۸۴۔



بعد مرتد ہو جاتا تھا تو اسے سخت وحشیانہ قسم کی سزا دی جاتی تھی، جب کہ مسیحی عیسائیت ترک کر کے اگر اسلام کو اختیار کر لیتے تھے، تو ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا[1]۔

سیمونٹ کا یہ خیال غلط ہے، در اصل مرتد کی سزا صرف عیسائیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ اسلامی شریعت کے رو سے جو مسلمان بھی اسلام سے منحرف ہو کر کسی اور دین کو قبول کرلے اسے مرتد کی سزا دی جائے گی، اس میں عیسائی اور غیر عیسائی یکساں اور برابر ہیں۔

**متعصب عیسائیوں کی ایک مذہبی تحریک کا ذکر**

کتاب کے چھٹے باب میں بڑے جذباتی انداز میں عیسائیوں کی ایک مذہبی تحریک کا ذکر "مستعربین مقتل شہادت میں" کے عنوان سے کیا گیا ہے، حالانکہ صحیح معنوں میں یہ خودکشی کی ایک تحریک تھی جو بعض متعصب عیسائیوں کی طرف سے چلائی گئی تھی، اس تحریک کے کارکن قرطبہ اور اندلس کے دوسرے شہروں کی مسجدوں میں گھس جاتے اور نمازیوں کے جم غفیر میں برملا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر سب و شتم کرتے تھے، اس کے جواب میں مسلمان برگشتہ ہو کر ان پر ٹوٹ پڑتے اور بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ زخمی ہوتے اور بسا اوقات اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔

سیمونٹ نے اس تحریک کے ذکر میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے، اور اس میں ہلاک ہونے والے عیسائیوں کو شہداء اور دین داری و اخلاص کا پیکر بتایا ہے، عہد وسطیٰ کے بعض عیسائی مورخین نے بھی اپنی لاطینی کتابوں میں اس تحریک کا ذکر کیا ہے، اور اسے "تحریک شہادت" کا نام دیا ہے، یہ تحریک کئی برس تک قائم رہی۔

سیمونٹ نے ان متعصب عیسائیوں کے واقعات بھی درج کیے ہیں، چنانچہ امیر عبدالرحمٰن الاوسط (۲۰۶ھ تا ۲۳۸ھ) کے عہد میں قرطبہ کے کسی گرجا کے ایک پادری کا

---

[1] المستعربین ص ۸۸۔

ذکر کیا ہے، جس کا نام پرنکتوس تھا، اندلس کے عام باشندوں کی طرح وہ عربی خوب جانتا تھا، اور مسلمانوں سے عقائد کے بارے میں بحث و مباحثہ بھی کیا کرتا تھا، ایک روز دوران بحث میں کسی مسلمان نے اس سے پوچھا: تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیحؑ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو، اس نے کہا کہ حضرت مسیحؑ میرے خدا ہیں، اور تمہارے پیغمبر کی نسبت ہماری انجیل میں ایک آیت یہ ہے کہ آخری زمانہ میں جھوٹے نبی ہوں گے جن کے پیرووں کی کثرت تعداد سے دھوکہ مت کھانا، یہ کہہ کر اس نے کہا کہ تمہارے نبی (نعوذ باللہ) ان ہی میں سے ہیں، یہ پادری اسی پر خاموش نہ ہوا، بلکہ اس سے بڑھ کر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور بھی بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

پھر آگے وہ خود عیسائیت کے اس عظیم ہیرو کی نسبت لکھتے ہیں:

"پادری کی یہ باتیں سن کر مسلمان گو سخت طیش میں آئے، مگر انھوں نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا، بلکہ اسے صحیح سلامت جانے دیا، اور قاضی کے سامنے جا کر فریاد کی کہ فلاں پادری نے ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ اور بے ادبی کے الفاظ کہے ہیں، چنانچہ قاضی کی عدالت میں پرنکتوس پر مقدمہ چلا، اور بالآخر اسے سزائے قید دی گئی، اس وقت عبد الرحمن اوسط کے محل میں ایک آختہ رہتا تھا جس کا نام نصر تھا، یہ پہلے عیسائی تھا، مگر بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، اور اپنی چال بازی سے بادشاہ کا محبوب اور مقرب بن گیا تھا، اس کو عیسائیوں سے سخت عداوت تھی، یہ ابتداءً خود عیسائی تھا، مگر اس نے اپنے آقاؤں کا مذہب اختیار کر لیا تھا، اسے جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ دوڑا ہوا قاضی کے پاس گیا، اور قاضی سے کہا کہ وہ پرنکتوس کو قتل کی سزا دیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور پرنکتوس کا سر کاٹ کر قصر خلافت کے دروازے پر آویزاں کر دیا گیا"۱؎

---

۱؎ المستعربین ص ۳۸۵ - ۳۸۶۔



غرض سیمونٹ نے پرنکتوس کے اس واقعہ کو انتہائی جذباتی انداز میں پیش کیا ہے، اور اسے کلیسا کے ایک ہیرو کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ آج بھی کلیساؤں میں ۱۸ اپریل کو جو پرنکتوس کے قتل کا دن ہے "سان پرنکتوس" کے نام سے ایک تقریب منائی جاتی ہے،

دراصل جو مذہبی جنون پرنکتوس پر سوار تھا وہی سیمونٹ کے دل میں بھی موجزن ہے، یہ بھی اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لعن طعن کیا جائے، حالانکہ اس واقعہ کی جو تفصیل انھوں نے بیان کی ہے، وہ نہ تو از روئے تحقیق ہی درست ہے، اور نہ ہی تاریخی حیثیت سے اس کو کوئی اہمیت حاصل ہے، پھر اندلس میں مسلمانوں کے عہد میں منصب قضا کو جو غیر معمولی اہمیت و عظمت اور قاضیوں کو جو بڑی خود مختاری حاصل تھی، اس کو اگر مدنظر رکھا جائے تو یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ محکمۂ قضا کے کسی معاملہ میں خود سلطان بھی کوئی دخل اندازی کرتا تھا، چہ جائیکہ قصر امارت کا کوئی خواجہ سرا، محض یہی بات اس واقعہ کے فرضی اور جعلی ہونے کا ثبوت ہے۔

**پادری سمسون کا مبالغہ آمیز تذکرہ** اس کتاب کے اکیسویں باب میں اندلس کے ایک پادری سمسون کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو ۸۱۰ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا تھا، سیمونٹ نے اس کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہوئے اس کے جذبۂ ایمان کی بڑی ستائش کی ہے، یہ شخص صاحب قلم بھی تھا، اس نے کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں سب سے مشہور کتاب اپولوجیٹکو (Apologatico) یعنی جدل و مناظرہ ہے۔

یہ سخت بدزبان اور بدمزاج تھا، اور اس نے بڑے درشت اور ناروا لب و لہجہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کی ہے، نیز اس نے مستعربین کو خارج از دین

قرار دیا ہے، کیونکہ انھوں نے اسلامی خصائل و عادات اختیار کر لیے تھے، اور مذہبی امور میں بھی
وہ اسلام سے متاثر تھے، اس نے انتہائی دریدہ دہنی سے یہ بات بھی لکھی ہے کہ،

" اور مسلمانوں سے متاثر ہونے کے نتیجہ میں انھوں نے ان سے جنسی بے راہ روی بھی
سیکھ لی تھی۔"

پادری سیمونٹ کا یہ گھناؤنا الزام جہاں اس کے مذہبی تعصب کی غمازی کرتا ہے، وہاں
تاریخ سے اس کی ناواقفیت پر بھی دلالت کرتا ہے، جنسی بے راہ روی کی وبا تو ہسپانوی
باشندوں میں زمانۂ قدیم ہی سے رائج تھی، یہ اصلاً روم کے اثر کا نتیجہ ہے، جس کے ماتحت
اسلامی دور سے پہلے سپین تھا، اس لیے اس وبا کا سرچشمہ روم تھا، نہ کہ مسلمان، ان کا
معاشرہ کلیتہً اس مرض سے محفوظ تھا، بعد میں اگر اس طرح کی کچھ باتیں ان میں رونما ہوئیں تو
ان کی بنیاد ہسپانیہ کے یہی باشندے تھے۔

عمر بن حفصون کی بیجا ستائش

کتاب کے تئیسویں باب میں ایک قانون شکن اور حکومت سے
باغی شخص عمر بن حفصون کا تذکرہ ہے[1]۔ جو اندلس کی اسلامی حکومت کا نہایت بدخواہ اور بدعہد
باغی تھا، یہ مسلمانوں سے جب بھی کوئی معاہدہ کرتا تھا تو اس کی خلاف ورزی ضرور کرتا تھا، اسکی
اس بری خصلت کا ذکر عرب اور یورپین مورخین دونوں ہی نے کیا ہے، مگر ان تمام تاریخی شواہد
کے باوجود سیمونٹ نے اسے ایک وطن پرست اور مذہبی کردار کا حامل شخص قرار دیا ہے، نیز
اس کا بڑا طویل تذکرہ قلمبند کیا ہے۔

دراصل سیمونٹ نے اس کا تذکرہ اس قدر مبالغہ آرائی سے اس وجہ سے کیا ہے کہ یہ آخر
عمر میں مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا تھا، حالانکہ اس کے بعض لڑکے مسلمان ہی رہے، اور وہ عبدالرحمٰن الناصر

[1] المستعربون ص ۵۱۳ و ما بعد



کے مقربین میں شامل بھی تھے۔

مسلمانوں کے تمدنی کارناموں کا سہرا مستعربین کے سر باندھنے کی کوشش

کتاب کا تیسواں باب ہسپانیہ کے ایک اسقف ربیع بن زید کیلئے
خاص ہے، اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عبدالرحمٰن
الناصر کے عہد میں جو بھی علمی اور فکری کارنامے انجام پائے، وہ سب اسی شخص کی بدولت ہوئے،
مگر یہ سراسر لغویات ہے جس کو کوئی معقول شخص باور نہیں کر سکتا، کہ اس وسیع و عریض ملک کے
گوناگوں اور متنوع تہذیبی و تمدنی کارنامے تنہا کسی ایک ہی شخص کے رہین منت ہیں۔

سیمونٹ کے خیال میں ربیع بن زید کا دوسرا نام ریکمینڈ ہے جو مشہور کتاب "تفضیل الازمان
و مصالح الابدان" کا مصنف ہے، اس کتاب کے بارے میں علامہ مقری لکھتے ہیں:

" اس میں چاند کی منزلیں اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے، یہ اپنے موضوع پر بے نظیر کتاب
ہے، جو اصلاً علم فلاحت سے متعلق ایک زائچہ ہے[1]۔"

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں، اولاً تو ابھی تک اس کا کوئی قطعی ثبوت نہیں مل سکا ہے
کہ ربیع بن زید ہی کا دوسرا نام ریکمینڈ ہے، ثانیاً خود اس امر میں بھی شک ہے کہ وہی اس کتاب کا
مصنف ہے، خود سیمونٹ نے بھی اس شک کا اظہار کیا ہے۔

دراصل اندلس کے ایک جدید الاسلام خانوادے کے ایک فرد عریب بن سعد قرطبی
(متوفی ۳۶۹ھ / ۹۸۰ء) نے تاریخ، طب، فلک اور فلاحت وغیرہ مختلف علوم و فنون میں متعدد
کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، انھوں نے ارضیات کا بھی ایک زائچہ تیار کیا تھا، پروفیسر ڈوزی
نے اس کا اور ربیع بن زید کی جانب منسوب زائچہ کا تقابل کیا ہے، جس کی دلچسپ روداد مستشرق
پالنشیا کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

[1] نفح الطیب ج ۴، ص ۱۷۶۔

"عریب بن سعد نے ۳۴۹ھ / ۹۶۱ء میں ایک زائچہ مرتب کیا تھا جس کے تمام نسخے ضائع ہوگئے، صرف ایک نسخہ دستیاب ہوا جو عبرانی رسم الخط میں تھا، پروفیسر ڈوزی نے مطالعہ و تحقیق کے بعد اسے مرتب کیا، اور اسے زائچہ قرطبہ ۹۶۱ء کے نام سے معنون کیا، اتفاق سے اسی اثنا میں جیرموبسیری کو ربیع بن زید کے زائچہ کا بھی ایک لاطینی ترجمہ مل گیا، جسے انھوں نے اپنی کتاب "تاریخ علوم ریاضی" کے حاشیہ میں شائع کیا، پروفیسر ڈوزی نے جب اس کا عریب بن سعد کے زائچہ سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ لاطینی ترجمہ جس کی نسبت ربیع بن زید کی جانب کی جاتی ہے، اصلاً بعض اضافوں کے باوجود عریب ہی کے زائچہ کا ترجمہ ہے، پروفیسر ڈوزی کی اس تحقیق سے مستشرق اڈوار ساقدرا اور موسیو سیمونٹ نے بھی اتفاق کیا ہے[1]۔"

سیمونٹ کی اس سے بڑھ کر اور کیا تضاد بیانی ہوسکتی ہے کہ وہ ایک طرف تو اس زائچہ کو ربیع بن زید کی تصنیف قرار دیتے ہیں، اور دوسری طرف اس تحقیق سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ یہ زائچہ اس کا نہیں بلکہ ایک مسلمان عریب بن سعد کی تصنیف کا ترجمہ ہے، علیٰ ہذا القیاس فاضل مستشرق نے اس کی بھی کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے کہ ربیع بن زید ہی دراصل ریکیمنڈ ہے، اس پر مستزاد یہ کہ وہ اسی شخص کو عبدالرحمن الناصر کے عہد کی تمام علمی اور فکری سرگرمیوں کا محور قرار دیتے ہیں، اور عریب بن سعد کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ یہ امر قطعی طور پر ثابت و مسلم اور مشہور و معروف ہے کہ وہ عبدالرحمن الناصر کے عہد میں موجود تھا، اور اس نے اپنا یہ زائچہ ۳۴۹ھ میں مرتب کیا تھا،

تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ربیع بن زید بھی ایک زبردست مذہبی عالم اور صاحب علم و فن تھا،

۱؎ تاریخ الفکر الاندلسی، حاشیہ ص ۴۸۷ - ۴۸۸۔



اسے خلیفہ عبدالرحمن کا قرب بھی حاصل تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ ہر مذہب کے علماء اور فضلاء کی قدر کرتا تھا، چنانچہ اس نے ربیع بن زید کو جرمنی کے بادشاہ ہوتو کے پاس اپنا پیغامبر بنا کر روانہ کیا، یہی نہیں بلکہ خلیفہ نے ایک یہودی طبیب ابو یوسف حسدای بن عزرا بن شبرط کو بھی اپنا وزیر نامزد کیا تھا۔

دراصل اس رواداری کا تعلق تنہا عبدالرحمن الناصر ہی کی ذات سے نہیں ہے، بلکہ یہ تو خود اسلامی تعلیم ہے کہ عیسائی اور یہودی بھی اگر کسی منصب کے اہل ہوں تو انھیں اس پر مامور کیا جائے، اگر ایسی بات نہ ہوتی تو خلیفہ عبدالرحمن جو مسلمانوں کا فرماں روا تھا، اور مسلمان علماء اس کے مشیر تھے، جن میں بعض ایسے اصحاب علم و فہم تھے جو جرأت و ہمت اور حق گوئی و بے باکی میں ممتاز تھے، اور اکثر و بیشتر خلیفہ کو تاکید و تنبیہ کیا کرتے تھے، وہ ضرور کسی عیسائی کو سفیر اور یہودی کو وزیر بنائے جانے پر معترض ہوتے، عبدالرحمن الناصر ہی کے عہد میں منذر بن سعید البلوطی جیسے جری عالم گذرے ہیں، جن کے بارے میں علامہ فتح بن خاقان لکھتے ہیں:

"کبھی تقویٰ سے ان کا دل خالی نہ ہوا، اور نہ گناہ آلودہ ہوا، عبدالرحمن الناصر کے عہد میں قرطبہ کے قاضی مقرر ہوئے، اور بہت عمدہ عدل و انصاف کیا، فضل کو عام اور ظلم و جور کا خاتمہ کیا، حق کی صدا بلند کی، باطل کو سرنگوں کیا، بہت جری اور بہادر تھے، بزدلی نام کو نہ تھی، اور نہ ہی عاجز و بے بس تھے، حق و انصاف کے معاملہ میں اللہ کی کسی مخلوق سے کبھی ڈرتے نہ تھے[1]۔"

ابو یوسف حسدای بھی ایک مدت تک منصب وزارت پر فائز رہا، دربار خلافت

۱؎ مطمح الانفس، ص ۳۷۔

میں اس کو بڑی اہمیت اور احترام حاصل تھا، اس نے مسلمانوں کی رواداری کے پیش نظر قرطبہ میں تلمود اور عبرانی زبان کی تعلیم کے حلقے قائم کرلیے تھے، جس کے نتیجے میں اس ملک میں عبرانی ادب کو فروغ حاصل ہوا۔

غرض سیمونٹ نے جہاں بھی اندلس کے علوم و فنون کا تذکرہ کیا ہے، اس میں عیسائیوں ہی کی سرگرمیاں بیان کی ہیں، اور مسلمان علماء کو سرے سے نظرانداز کردیا ہے، انھوں نے دوسری صدی عیسوی کے ایک رومی النسل فلسفی کولومیلا کا ذکر بڑے مبالغہ سے کیا ہے، جب کہ اس شخص کی کتاب "الفلاحۃ" کا ترجمہ عربی میں موجود ہے اور اصل کتاب ناپید ہے، اسی طرح انھوں نے "تاریخ حکومت روم" کے مصنف باولس ہوروشیوس کا بھی تذکرہ بڑی بلند آہنگی سے کیا ہے، جس کی کتاب کا ترجمہ چوتھی صدی ہجری کے ایک مسلمان عالم اور فقیہ و محدث قاسم بن اصبغ البیانی کرچکے ہیں، جو خود بڑے اچھے اور ماہر مترجم تھے، مگر اپنی علمی دیانت داری کی بناپر انھوں نے قرطبہ کے ایک اسقف سے بھی ترجمہ میں مدد لی تھی:

اسی طرح اندلس کے اور مسیحی علماء کا تذکرہ کرتے ہوئے سیمونٹ لکھتے ہیں:

"اندلس کے ان ہی عیسائیوں کی وجہ سے اس ملک میں مختلف علوم و فنون ریاضی اور طب وغیرہ کا رواج ہوا، ورنہ عام مسلمان تو ان فنون کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، جس کا اعتراف خود مسلمان مورخین نے بھی کیا ہے[1]"

حقیقت یہ ہے کہ ابن ابی عامر کے عہد میں بعض خاص اسباب و حالات کی بناپر فلسفہ سے اشتغال و انہماک پر پابندی عائد کردی گئی تھی، اسی کو سیمونٹ نے عام مسلمانوں کی صورت اور ان کا طرز عمل قرار دیا ہے اور اس کی دلیل پیش کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

[1] المستعربون ص ۴۵۔



"اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ فن زراعت، طب اور صنعت و حرفت پر مبنی دوسرے علوم و فنون میں ہم کو جو کتابیں دستیاب ہوئی ہیں وہ اکثر ان ہی مستعربین کی لکھی ہوئی ہیں جو اندلس کے اسلامی عہد میں وہاں مقیم تھے[1]"

پھر اس کی مزید وضاحت وہ حاشیہ میں اس طرح کرتے ہیں

"جیسے مشہور طبیب عبدالرحمن الناصر جس کا اصل نام یحییٰ بن اسحاق تھا، اور جو پیدائشی عیسائی تھا، مگر مرتد ہوکر مسلمان ہوگیا تھا"

گویا اندلس کے وہ تمام باشندے جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا ان کے نزدیک مرتدین ہیں، اس طرح کے لوگوں میں بڑے بڑے علماء اور فضلاء بھی شامل ہیں، جن کے بارے میں سیمونٹ کی یہ رائے ہے کہ

یہ کمزور طبیعت کے لوگ تھے، اس لیے انھوں نے دولت و اقتدار کے لالچ میں اپنا مذہب تبدیل کرلیا"

چونکہ سیمونٹ نے علوم و فنون کا دائرہ صرف دو ہی موضوعات تک محدود کردیا ہے، یعنی علم ریاضی[1] فلکیات اور علم طب[2]، اس لیے ہماری گفتگو بھی ان ہی دونوں علوم کے بارے میں محدود رہے گی، اور ہم ان سے متعلق اندلس کے ان مسلمان علماء کے کارناموں کا ایک اجمالی مرقع پیش کرنے پر اکتفا کریں گے، جو ربیع بن زید سے پہلے یا اس کے عہد میں گذرے ہیں،

اس دور کے اندلسی مسلمانوں میں علم ریاضی و فلکیات میں سرفہرست احمد بن نصر (متوفی ۲۳۲ھ) کا نام آتا ہے، ان کی اس موضوع پر بہت مشہور کتاب المساحۃ المجہولۃ[2] ہے پھر مسلمہ ابن احمد المجریطی (متوفی ۳۹۴ھ) ہیں، جو اقلیدس اندلس کے لقب سے مشہور تھے،

[1] المستعربون ص ۳۶۔ [2] نفح الطیب ج ۳ ص ۱۶۰۔

یہ اس فن میں ایک اسکول کے بانی اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جن میں مندرجۂ ذیل زیادہ مشہور ہیں: (۱) الاصطرلاب (۲) ثمار العدد (۳) تعدیل الکواکب، بطلیموس کی کتاب قبۃ الفلک کا ترجمہ بھی انھوں نے عربی میں کیا تھا جس کو بعد میں لاطینی میں بھی منتقل کیا گیا۔

مسلمہ نے اپنے بعد تلامذہ کی ایک بڑی تعداد چھوڑی، جو سب کے سب اس فن میں طاق تھے، قاضی صاعد اندلسی لکھتے ہیں:

"مسلمہ کے تلامذہ بہت کثیر تعداد میں تھے، شاگردوں کی اتنی بڑی تعداد اندلس کے کسی اور عالم کو میسر نہیں ہوئی"[1]

مسلمہ کے تلامذہ میں ابوالقاسم اصبغ بن محمد معروف بہ ابن السمح (متوفی ۴۲۵ھ) بڑے مشہور ہیں، ان کے بارے میں صاعد اندلسی کا بیان ہے کہ وہ علم اعداد و ہندسہ کے علاوہ علم ہیئت اور نجوم کے زبردست محقق اور عالم تھے، طب سے بھی انھیں خاص شغف تھا، ان کی کتابوں میں المدخل الی الہندسۃ، ثمار العدد اور طبیعۃ العدد کے علاوہ فن اصطرلاب میں دو کتابیں، اور کتاب سند ہند کے طرز پر ایک زیچ بھی شامل ہے۔

مسلمہ کے ایک شاگرد ابوالقاسم احمد بن عبداللہ معروف بہ ابن الصفار تھے، جن کا آبائی وطن قرطبہ تھا، مگر دانیہ میں وہ مقیم ہو گئے تھے، اور وہیں ۴۲۶ھ میں ان کا انتقال ہوا، یہ بھی اپنے عہد کے ایک اسکول کے بانی ہیں، جس میں قرطبہ کے علمائے ریاضیات کی ایک کثیر تعداد مطالعہ و استفادہ میں مشغول رہتی تھی، ان کی کتابوں میں کتاب العمل بالاصطرلاب اور سند ہند کے طرز پر ایک زیچ ہے، اسی طرح ان کے ایک بھائی جن کا نام محمد تھا، فن اصطرلاب میں بڑے ماہر تھے[2]

---

[1] طبقات الامم ص ۱۰۷، [2] ایضاً ص ۱۰۸۔



مسلمہ کے ایک شاگرد ابوعثمان سعید بن محمد بن البغونش طلیطلی (متوفی ۴۴۴ھ) بھی تھے، جو فلسفہ اور ریاضی دونوں میں غیر معمولی قدرت رکھنے کے علاوہ طب کے بھی ماہر تھے، کتب منطق کا بھی بڑا وسیع مطالعہ انھوں نے کیا تھا، انھوں نے جالینوس کی کئی کتابوں کی تحقیق کے علاوہ ان کی تصحیح اور ترتیب کا بھی کام انجام دیا ہے، مگر آخر عمر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، صرف قرآن مجید کی تلاوت میں وقت گذارتے تھے، اور اسی حال میں پچھتر ۷۵ برس کی عمر میں انتقال کیا[1]

اس فہرست میں ابوالحکم عمرو بن عبدالرحمن بن احمد الکرمانی کا بھی نام شامل ہے، جو علم عدد و ہندسہ کے علمائے راسخین میں شمار کیے جاتے تھے، یہ مسلمہ سے پڑھنے کے بعد مشرق چلے گئے، اور وہاں حران میں طب کا درس لیا، اور وہاں سے اپنے ہمراہ اخوان الصفاء کے رسائل لے کر اندلس واپس آئے، اور نوے ۹۰ برس سے زیادہ کی عمر میں ۴۵۸ھ میں سرقسطہ میں انتقال کیا[2]

اس کے بعد اندلسی مسلمانوں میں علمائے ریاضیات کی ایک دوسری نسل پیدا ہوئی، جن کے سرخیل ابو ابراہیم بن یحییٰ الزرقانی (متوفی ۴۸۰ھ) تھے، ان کے علم و فضل کا اعتراف مستشرق سانشر پیریز نے بھی کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"عربوں میں جتنے ماہرین فلکیات پیدا ہوئے، ان تمام میں ان کا درجہ سب سے بلند ہے، زمانۂ قدیم کے علمائے کبار میں ان کا شمار ہوتا ہے"[3]

زرقانی نے کواکب اور سیاروں کی نقل و حرکت سے متعلق بعض نئی ایجادات بھی پیش کیں، اور نازک قسم کے نئے آلے بھی ایجاد کیے جو زرقالیہ اور صفیحہ کہے جاتے تھے، یہی آلہ جات مغرب میں اوسفیا (Oafea) کے نام سے مشہور ہوئے۔

---

[1] طبقات الامم ص ۱۲۷-۱۲۸ [2] ایضاً ص ۱۰۹-۱۱۰ [3] تاریخ الفکر الاندلسی ص ۳۵۱۔

زرقانی کی سب سے اہم کتاب "کتاب الافق" ہے، جو اس فن میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، آلات کے ذریعہ کواکب کی نقل و حرکت کا پتہ لگانے کے سلسلہ میں اس نے ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا، اور اصطرلاب کے طریقے بھی اس نے بیان کیے ہیں، زرقانی کے ان کارناموں کے سبب انگریزوں نے اسے بڑی اہمیت دی ہے، اور اسے ایک لاطینی نام ازراتیل سے متعارف کرایا ہے۔

اس کے علاوہ اندلس کے مسلمان سلاطین بھی فلسفہ، ریاضی اور علم فلک کے بڑے شیدائی تھے، ان میں امیر سرقسطہ المقتدر باللہ بن ہود (متوفی ۴۷۴ھ) اور ان کے صاحبزادے المؤتمن پیش پیش ہیں، المؤتمن نے تو ان علوم میں اس قدر مہارت پیدا کر لی تھی کہ اس نے باقاعدہ اس فن پر کتاب الاستکمال کے نام سے ایک اہم کتاب تصنیف کی جس کے بارے میں موسیٰ بن میمون کا یہ قول ہے کہ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسی محنت اور توجہ سے پڑھائی جائے جس طرح اقلیدس کی کتابیں اور بطلیموس کی کتاب المجسطی پڑھائی جاتی ہے۔

علمائے ریاضیات کے اس مختصر سے تعارف کے بعد اب بعض علمائے طب کا بھی اجمالی تذکرہ ملاحظہ ہو، سیمونٹ کے خیال میں مسلمان اس علم سے قطعی ناآشنا تھے، جبکہ مستشرق پالنشیا لکھتے ہیں:

"اندلسی مسلمانوں کے درمیان علم طب نے بڑی ترقی کی"[1]

پالنشیا کے اسی مختصر سے فقرے سے اس علم میں مسلمانوں کی عظمت و اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے، البتہ ابتدا میں اندلسی مسلمان اپنے بچوں کو طب کی تعلیم کے لیے افریقہ، اور بلاد مشرق میں بھیجا کرتے تھے، اور یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب اندلس میں سب سے پہلے

---

[1] تاریخ الفکر الاندلسی ص ۴۶۱۔



ایک مسلمان طبیب یونس بن احمد حرانی مشرق سے وارد ہوا، چنانچہ اسی کے بعد عمر بن حفص بن برتی قیروان گیا، اور وہاں ابن جزار سے طب پڑھی، اور ان سے امراض کے علاج کی ایک کتاب "زاد المسافر" حاصل کی[1] اور محمد بن عبدون الجبلی نے مصر اور بصرہ کا رخ کیا، اور دونوں جگہوں پر طب کے حصول کے ساتھ ساتھ وہاں کے بیشمار اسپتالوں میں ٹریننگ حاصل کی، اور ۳۶۰ھ میں اندلس واپس ہوا[2]۔ کرمانی کا بھی ذکر پہلے آچکا ہے کہ وہ طب پڑھنے حران گئے اور وہاں سے رسائل اخوان الصفا لیکر واپس لوٹے۔

رفتہ رفتہ جب اندلس میں علم طب کو استحکام حاصل ہو گیا تو خود اندلسی اطباء نے درس و تدریس اور علاج و معالجہ کا سلسلہ شروع کر دیا، اس کے بعد بہت کم لوگ اس کے لیے باہر جاتے تھے، اس عہد کے اطباء میں سعید بن عبد ربہ بڑے حاذق طبیب تھے، یہ مصنف العقد الفرید کے بھتیجے تھے، اور خود بھی شاعر اور ادیب تھے، انھوں نے بخار کے علاج میں ٹھنڈی چیزیں استعمال کرانے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا[3]۔

عبد الرحمن بن اسحاق بن ہیثم بھی اس عہد کے ایک نامور طبیب ہیں، یہ فرماں روا منصور بن ابی عامر کے طبیب خاص تھے، ان کی ایک کتاب "الکمال والتمام" ہے جس میں دست اور قے لانے والی ادویہ کا تذکرہ ہے، اور دوسری کتاب "الاکتفاء بالدواء" ہے جس میں اشیاء کی خاصیت بیان کی گئی ہے۔

احمد بن یونس حرانی اور ان کے بھائی عمر بھی اس عہد کے مشہور طبیب تھے جنھوں نے لگاتار دس برس تک مشرق میں رہ کر علم طب سیکھا تھا، عمر کا جلد انتقال ہو گیا تھا، مگر احمد

---

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ج ۲، ص ۳۷ [2] طبقات الامم ص ۱۲۵۔

[3] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۲ ص ۴۲۔

خلیفہ المستنصر کے طبیب خاص مقرر ہوئے، یہ دواساز بھی تھے، ان کے مطب میں بارہ صقلبی نوجوان دواسازی سیکھتے تھے، اور معذوروں اور محتاجوں کو مفت دوائیں دی جاتی تھیں[12]۔

اس دور کے ایک اہم طبیب ابن جلجل علم نباتات کے بھی ماہر تھے، ان کی تصنیفات میں کتاب الترياق اور تاریخ الاطباء زیادہ مشہور ہیں۔

عریب بن سعد جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، ریاضیات کے ماہر ہونے کے ساتھ ہی بلند پایہ طبیب بھی تھے، انھوں نے نومولود بچوں کے دفع امراض کے لیے "خلق الجنین وتدبیر الحبالی والمولود" کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ اسکوریال میں موجود ہے۔

فخر الاطباء ابوالقاسم الزہراوی (۳۲۴ھ - ۴۰۳ھ) بھی اسی زمانہ کے صاحب کمال اطباء میں تھے، جن کی شخصیت عالم اسلام اور یورپ دونوں میں یکساں مقبول ہے، پیرس کے طبیہ کالج میں دوسرے بعض مشاہیر کی طرح ان کا بھی مجسمہ نصب کیا گیا ہے، اہل یورپ انھیں زہراوی کے بجائے ابولکاسیس (Abulcasis) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

فن جراحی کی ایجاد واختراع زہراوی کا عظیم الشان کارنامہ ہے، جراحی کے آلے وہ خود اپنے ہاتھ سے تیار کرتے تھے، اور ان کی مدد سے انھوں نے جو معرکۃ الآرا آپریشن کیے، وہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی مشکل اور خطرناک تصور کیے جاتے ہیں، وہ امراض چشم کے بھی ماہر تھے، اطباء نے ان کی عظمت اور غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے انھیں بقراط اور جالینوس کا ہم رتبہ قرار دیا ہے[1]، اور ان کی شہرۂ آفاق کتاب "التصریف لمن عجز عن التالیف" مسلمانوں کے علاوہ انگریزوں میں بھی بہت مقبول ہے، اور اس کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

اسی طرح اندلس کے دونوں عظیم فلسفی ابن باجہ اور ابن رشد بھی طبیب تھے، ابن باجہ

---

لہ تاریخ الفکر الاندلسی، ص ۳۶۶۔



اندلس کے مشہور طبیب سفیان اندلسی کے شاگرد تھے، انھوں نے اس کی کتاب "التجارب" کی تالیف میں اس کی معاونت بھی کی تھی، اور ابن رشد نے باقاعدہ اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی، جس کا نام "الکلیات" رکھا، اس میں اعضاء کی تشریح اور امراض کی تشخیص کے علاوہ ادویات اور اغذیہ کا بھی تذکرہ ہے۔

علم طب میں اندلس کا ایک خاندان زہرہ بڑا مشہور ہوا، اس کے سب سے پہلے طبیب ابومروان عبدالملک بن زہر (متوفی ۵۲۵ھ) تھے، جن کے بعد پھر اس خاندان میں اطباء کا ایک سلسلہ چل پڑا، یہ مشہور طبیب عبدالملک بن ابی العلاء کے دادا تھے، یہ کئی گرانقدر کتابوں کے مصنف تھے، جن میں کتاب الاقتصاد اور کتاب التیسیر کو بڑی شہرت ملی، ان ہی نے سب سے پہلے اطباء کو مشورہ دیا تھا کہ وہ جراحی کو طب اور دواسازی سے الگ رکھیں اور خود دواسازی نہ کریں[1]۔

غرض ریاضی، طب اور دوسرے علوم وفنون میں اندلس کے مسلمانوں کے کارنامے غیر معمولی اور اتنے گوناگوں ہیں کہ ان سب کا احاطہ ممکن نہیں، مگر اس کے باوجود دیمونٹ نے اندلس کے تمام ثقافتی اور تمدنی کارناموں کا سہرا وہاں کے عیسائیوں کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے، اور تمام نقائص کا باعث مسلمانوں کو قرار دیا ہے، نیز بحث کتاب میں صرف ملوک طوائف کا ذکر اچھے اور مناسب انداز میں کیا گیا ہے، مگر مجموعی حیثیت سے اس کے موضوع اور مواد کی وہی نوعیت ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے، اور اس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بے بنیاد الزام تراشی کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔

---

لہ تاریخ الفکر الاندلسی،

# علامہ شبلیؒ نعمانی کی تنقید نگاری

از

پروفیسر عبد المغنی، پٹنہ

عصر حاضر میں ادبی تنقید کا جدید ترین رجحان عملی تنقید ہے، جسے اہل مغرب کی اصطلاح میں اسلوبیاتی تنقید کہا جا رہا ہے، اگرچہ اس رجحان اور اصطلاح کو اردو کے کچھ نئے ناقدین بہت محدود مفہوم میں لے کر اس سلسلے میں گمراہ کن مبالغہ آرائی کر رہے ہیں، درحقیقت یہ اس مشرقی طرز تنقید کا احیاء ہے، جو قدیم تذکروں سے منسوب کی جاتی ہے، اور جسے پچھلی نصف صدی میں اردو کی مغرب زدہ تنقید رد کر چکی تھی، مولانا حالی نے "پیروی مغربی" کا نعرہ لگایا اور مقدمۂ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) میں اپنے تنقیدی مباحث کا معیار و محور مغربی تصورات کو بنایا، یہ مباحث نظریاتی قسم کے ہیں اور انھیں قدرے فلسفیانہ کہا جا سکتا ہے، ان کا تعلق تنقیدی افکار سے ہے، جن کا مقصد ادب کے ساتھ ساتھ سماج کی اصلاح و ترقی ہے، اس معاملے میں حالی کا جذبہ یقیناً قابل قدر ہے، اور انھوں نے کچھ دکھتی رگوں کو چھیڑا ہے، کچھ فاسد مواد پر نشتر لگایا ہے، لیکن ادب کے فنی پہلو پر انھوں نے بہت ہی کم روشنی ڈالی ہے، شاید اسلیے کہ انیسویں صدی کی مغربی تنقید کے بعض تخیلات نے ان کی نگاہ پر پردے ڈال دیئے تھے، اس کے برخلاف علامہ شبلی زندگی، سماج اور ادب کے بارے میں معین، واضح اور جامع نظریات رکھنے کے باوجود اول تو فلسفۂ تنقید کے بجائے عملی تنقید پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، دوسرے ادبی تصورات پر مباحث میں ان کا مرکز حوالہ اور معیار نظر مغربی خیالات نہیں، مشرقی افکار ہیں،



اگرچہ ان افکار کی تشریح وہ ایک مقلد کی طرح نہیں، مجتہد کی طرح کرتے ہیں، اس سلسلے میں شعر العجم کی جلد اول اور اس سے زیادہ جلد چہارم کے ابتدائی حصے علامہ شبلی کے تنقیدی افکار کی دستاویزیں بیسویں صدی کے بالکل اوائل میں پیش کرتے ہیں، جب کہ اس وقت اردو میں عملی تنقید کا شاہکار "موازنۂ انیس و دبیر" منظر عام پر آیا، یہ شاہکار مشرقی طرز تنقید کا بہترین نمونہ ہے،

اس طرح علامہ شبلی کی تنقید نگاری، مشرق میں تنقید نگاری کی بہترین روایات میں ایک عظیم الشان توسیع و اضافہ ہے، یہ توسیع و اضافہ دنیائے ادب میں ایک تاریخی حیثیت اور حقیقی اہمیت رکھتا ہے، اس کے ذریعے قدیم تذکروں کے تنقیدی تبصروں کا تسلسل قائم ہوا، اور ان کا فطری ارتقا عمل میں آیا، الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کے فنی مضمرات و اثرات کا ایک منظم نقشہ مرتب ہوا اور خاص کر شاعری کے طلسم کی کلید ہاتھ آئی، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے، دور جدید میں بیک وقت فلسفہ و سیاست، سائنس اور صنعت کی یلغاروں سے ادب کی نازک ترین صنف اور اس کے لطیف ترین فن کو محفوظ رکھنے کا نسخہ اسی کارنامے سے میسر آتا ہے، میتھو آرنلڈ نے انیسویں صدی کے اواخر میں شاعری کے مستقبل کا سوال اٹھایا تھا، جب کہ بیسویں صدی کے وسط میں سی، پی، اسنو نے جدید تہذیب کے دو حصوں میں تقسیم ہو کر سائنس کے مقابلے میں آرٹ کی شکست اور زوال کا نکتہ پیش کیا، علامہ شبلی نے محاکات اور تخیل کو عناصر شاعری قرار دے کر سائنس سے الگ آرٹ کی ہستی کا جو حسین مرقع تیار کیا وہ ہر دور میں ادب کی اہمیت، معنویت اور افادیت پر ایک تاکیدی نشان لگاتا ہے، علامہ شبلی کی تنقید ادب صحیح معنوں میں فن لطیف بالخصوص شاعری کے ذریعے انسانی زندگی کی مسرت و بصیرت کے امتزاج کا ایک دائمی نسخہ تجویز کرتی ہے، اس نسخے کے

اجزاء مثنوی، مرثیہ اور غزلیات ہیں، خواہ وہ فارسی میں ہوں یا اردو میں، دیگر اصنافِ شاعری بھی مثلاً رباعی اور قصیدہ ان اجزا میں شامل ہیں،

کہا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی جمالیات پسند ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ والٹر پیٹر اور آسکر وائیلڈ جیسے انیسویں صدی کے اواخر کے انگلستان میں ابھرنے والے زوال پسند ہیں، جو فن برائے فن اور نشاط پرستی کے قائل ہیں، علامہ شبلی کی اخلاقیات کسی طرح مولانا حالی کی اخلاقیات سے کم نہیں ہیں، بلکہ زندگی کے عام معاملات میں کچھ زیادہ ہی ہیں، اس لیے کہ علامہ شبلی مولانا حالی سے آگے بڑھ کر ایک سراسر اخلاقی نظامِ حیات کے احیا اور اس مقصد کے لیے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے علم بردار تھے، چنانچہ ان کی تمام علمی وادبی اور تعلیمی و تصنیفی جد وجہد کا مرکز و محور یہی مقصد تھا، المامون، النعمان، الغزالی اور الفاروق سے سیرۃ النبی تک علامہ شبلی کے قلم سے تحقیق و تاریخ کے جو جواہر نکلے انھی کی تابانی "موازنۂ انیس و دبیر" کے موضوع مرثیہ امام حسین سے ہویدا ہے، اسی طرح شعر العجم بھی اسی جذبے سے لکھی گئی جو مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر ایک رسالے کی تصنیف کا باعث ہوا تھا، عبرتِ حال اور سامانِ مستقبل کے لیے عظمتِ ماضی کی بازیافت تعلیم، تاریخ اور ادب سبھی دائروں میں علامہ شبلی کو مقصود تھی، لیکن وہ اخلاقیات اور جمالیات کو ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں کرنا چاہتے تھے، ان کی تنقیدی حس خلطِ مبحث کی روادار نہیں تھی، ان کے بلند اور گہرے ذوق و شعور کا تقاضا تھا کہ ادب میں موضوع کی اخلاقیات اور ہیئت کی جمالیات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے میں ضم نہ ہوجائیں، وہ میتھو آرنلڈ کی طرح مذہب کا مستقبل سائنس اور صنعت کے دور میں بھی شاعری کے ساتھ وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے کہ ان کا مذہب انگریز نقاد کے مانند کسی ذاتی رویے کا نام نہیں تھا، پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کا معین ضابطہ تھا، جس کے احاطے میں دوسرے دائروں کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے حلقے



بھی تھے، لیکن علامہ شبلی کی دینی بصیرت اور نظمِ فکر کے مطابق ہر دائرے اور حلقے کے اپنے آداب و لوازم تھے جن کا اعتبار و لحاظ اس دائرے اور حلقے میں کوئی موثر کام کرنے کے لیے ضروری تھا، اس سلسلے میں ادب کا معاملہ اسالیبِ بیان کی جمالیات کا تھا، یہ جمالیات درحقیقت وہ وسائلِ اظہار ہیں جو اخلاقی موضوعات کا پرتاثیر ابلاغ کرتے ہیں، علامہ شبلی کے واضح اور خالص مشرقی ذہن نے اس اہم ترین نکتے کو پالیا تھا، لہٰذا وہ ادب میں تزئینِ ہیئت کی ایک سوئی پر زور دیتے تھے، ان کی تنقیدوں کے علاوہ ان کا فارسی دیوان شاعری جو فنی طور پر غالب کے فارسی دیوان سے کم نہیں ہے، اس واقعے پر دلالت کرتا ہے، علامہ شبلی کی نثر کا حسن و جمال بھی ان کے تبلیغی مقصد کا عکاس ہے، جارج برنارڈ شا نے اپنے مشہور ڈرامے "مین اینڈ سوپر مین" میں بالکل صحیح کہا ہے کہ اسلوبِ بیان اس ادیب کا زیادہ سے زیادہ موثر ہوتا ہے، جو اپنے افکار کی تبلیغ کرنی چاہتا ہے،

**تصورات** علامہ شبلی کے تنقیدی کمالات کا ایک جائزہ لینے کے لیے ان کی قابلِ ذکر ادبی تصانیف کے چند اہم اقتباسات کا مطالعہ مفید ہوگا،

سوانح مولانا روم میں مولانا کی مثنوی کے خاص اسلوب پر علامہ شبلی اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں،

"سب سے بڑی خصوصیت جو مثنوی میں ہے، وہ اس کا طرزِ استدلال اور طریقۂ افہام ہے، استدلال کے تین طریقے ہیں، قیاس، استقرا، تمثیل، چونکہ ارسطو نے ان تینوں میں قیاس کو ترجیح دی تھی، اس لیے اس کی تقلید سے حکمائے اسلام میں بھی اس طریقہ کو زیادہ تر رواج ہوا، علامہ ابن تیمیہؒ نے الرد علی المنطق میں ثابت کیا ہے کہ قیاس شمولی کو قیاس تمثیلی پر کوئی ترجیح نہیں، بلکہ بعض وجوہ سے تمثیلی کو ترجیح ہے، ہم اس موقع پر یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتے

بلکہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مولانا روم نے زیادہ تر اسی قیاس تمثیلی سے کام لیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ عام طبائع کے افہام و تفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم یہی طریقہ ہے، استدلال تمثیلی کے لیے تخیل کی بڑی ضرورت ہے جو شاعری کی سب سے ضروری تر شرط ہے، اس بنا پر مثنوی کے لیے یہی طریقہ زیادہ تر مناسب تھا، مولانا کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے، وہ بھی قوت تخیل ہے، تصوف اور سلوک کے مسائل اور مسلمات عام ادراک بشری سے خارج ہیں، اس لیے جو شخص خود اس عالم میں نہ آئے وہ ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتا الٰہیات کے اکثر مسائل بھی عام لوگوں کے فہم سے برتر ہیں، اس لیے ان مسائل کے سمجھانے کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ ان کو مثالوں اور تشبیہوں کے ذریعہ سے سمجھایا جائے،

(ص ۴۷)

اسی کتاب میں مولانا روم کے دیوان غزلیات پر علامہ شبلیؒ کا ایک خیال انگیز تبصرہ حسب ذیل ہے:

"یہ امر عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مولانا کے زمانہ تک غزل نے کسی قسم کی ترقی نہیں کی تھی، اور کر بھی نہیں سکتی تھی، غزل دراصل سوز و گداز کا نام ہے، اور اس وقت جو لوگ شعر و شاعری میں مشغول تھے، صرف وہ تھے جنھوں نے معاش کی ضرورت سے اس فن کو پیشہ بنایا، عشق و عاشقی سے ان کو سروکار نہ تھا، چنانچہ اس زمانے کے جس قدر شعرا ہیں ان کے کلام میں صنائع لفظی اور الفاظ کی مرصع کاری کے سوا جوش اور اثر نام کو بھی نہیں پایا جاتا" (ص ۲۷)

پہلے اقتباس میں تخیل کو روح شاعری قرار دے کر تمثیل اور تشبیہ کو شاعرانہ استدلال کا بہترین طریقہ تصور کیا گیا ہے، یہ مثنوی کی شکل میں نظم نگاری کے موثر ترین اسلوب کا تنقیدی بیان ہے، جس کی روشنی میں مولانا روم کی شاعری کے طلسم کی کلید فراہم کی گئی ہے، اس طرح مثنوی مولوی معنوی کی متصوفانہ فکر کے ساتھ ساتھ اس کی شاعرانہ فن کاری کا نہایت معقول تجزیہ کیا گیا ہے، "تصوف اور سلوک کے مسائل اور مسلمات" کو مثنوی مولانا روم کا موضوع تسلیم کر کے علامہ شبلیؒ نے تنقید کا سارا زور اسلوب کی ایسی توجیہ و تشریح پر صرف کیا ہے، جو اسے موضوع کے مناسب اور اس کے اظہار کے لیے سب سے موزوں وسیلہ ثابت کرتی ہے، انتقاد کا یہی انداز علامہ شبلی کی خصوصیت ہے، جو ان کی تمام تنقیدوں میں نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی کا یہ خیال کہ مولانا کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے، وہ یہی قوت تخیل ہے، ظاہر کرتا ہے کہ علامہ شبلی ادب میں فکر کے ساتھ ساتھ فن کی اہمیت پر تاکیدی نشان لگاتے ہیں، اور فنی تقاضوں کی تکمیل کے بغیر محض درس اخلاق یا فلسفہ طرازی کو شاعری تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، وہ نظم اور شعر کا فرق جانتے ہیں، اور اس کی پوری وضاحت بھی کر سکتے ہیں،

دوسرے اقتباس میں غزل اور تغزل کے امتیازی اوصاف "سوز و گداز" کو قرار دیا گیا ہے، جس کا سرچشمہ "عشق و عاشقی" ہے اور نتیجہ "جوش اور اثر"، رومی کی غزلیات میں انھی اوصاف و کوائف کا سراغ لگا کر علامہ شبلی نے فارسی میں ان کی اہمیت واضح کی ہے، یہاں عشق و عاشقی کے الفاظ وسیع ترین معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں، علامہ شبلی کا مفہوم یہ ہے کہ عشق حقیقی کا فیضان عرفان قلب شاعر میں وہ سوز و گداز پیدا کرتا ہے جو تغزل کے جوش و اثر کا باعث ہوتا ہے،

موازنہ انیس و دبیر کو علامہ شبلی نے کتاب کی "تمہید" کے مطابق "کلام فصیح ہوتا ہے اور بہت اچھا لکھتے ہیں"، کے مروجہ تصور کو رد کر کے یہ واضح کرنے کے لیے تصنیف کیا کہ میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر نمونہ ہے،" اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کی تنقیدی بصیرت مرثیہ کو محض روایتی نوحہ سمجھنے کے بجائے ایک اعلیٰ شاعری کا نمونہ قرار دیتی ہے، اس سلسلے میں میر انیس کے

محاسن شاعری، کی تفصیل میں علامہ شبلی نے بحث کے جو عنوانات قایم کیے ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ بحیثیت شاعری انیس کی مرثیہ نگاری کا مطالعہ انھوں نے کس پیمانہ پر کیا ہے، فہرست مضامین کے حسب ذیل اندراجات سے اس پیمانے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے،

کلام کی فصاحت، کلام کی اصلی ترتیب کا قایم رہنا، مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال، بحر و ردیف و قافیہ کی موزونی، بلاغت، ہر قسم کے مضمون کے لیے بلاغت کے جداگانہ طریقے، تسلسل بیان، استعارات اور تشبیہات، صنائع و بدائع، جذبات انسانی اور اس کی مثالیں مناظر قدرت، واقعہ نگاری، رزمیہ،

اس فہرست کے خاص نکات ہیں، اول فصاحت و بلاغت کا امتزاج، دوم بحر و ردیف و قافیہ کی افادیت، سوم ترتیب و تنظیم، چہارم بیانیہ منظر نگاری، پنجم رزمیہ کا عنصر، ان میں سے ہر ایک نکتہ تنقیدی طور پر اہم ہے، اور سب نکتوں کا اجتماع اس حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے، کہ علامہ شبلی بیک وقت نظم اور شاعری دونوں کی خوبیوں کا سراغ میر انیس کے مراثی میں لگاتے ہیں، یہ کسی صنف شاعری میں رونما ہونے والے کمالات کا وسیع و عمیق اور مکمل مطالعہ ہے، اس مطالعے کے بعض اجزا کے اقتباسات ملاحظہ ہوں،

"ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے، وہ بہ حال خود قایم رہے، مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقات فعل، جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں، یہی ترتیب شعر میں بھی قایم رہے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ شعر میں اس ترتیب کا بعینہ قایم رہنا قریب قریب ناممکن ہے، صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت شعر دو شعر میں اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے..... لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے،



اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے، اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیے کہ اگر اصلی ترتیب پوری پوری قایم نہیں رہ سکتی تو بہر حال اس کے قریب قریب پہنچ جائے، جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا، اسی قدر شعر زیادہ صاف، برجستہ، رواں اور دلنشین ہوگا، اور اردو میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ صنف میر انیس صاحب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی، (ص ۴۳ - ۴۴)

"واقعات کے بیان میں بلاغت کا ایک بڑا ضروری اصول یہ ہے کہ کہیں سے سلسلۂ بیان ٹوٹنے نہ پائے، جب کوئی واقعہ مختلف اور متعدد واقعات پر مشتمل ہوتا ہے تو ایک واقعے سے دوسرے واقعے کی طرف منتقل ہوتے ہوئے اکثر بیان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، یا زائد اور بھرتی کے لفظ لانے پڑتے ہیں، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی ایک واقعے کا دوسرے سے پیوند لگایا ہے، مرزا دبیر صاحب کے کلام میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں، میر انیس کے اکثر مرثیے بہت سے متعدد واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ان پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر واقعہ ایک جداگانہ مرثیے کا موضوع ہے، لیکن تسلسل بیان کا یہ اثر ہے کہ تمام مختلف واقعات ایک مسلسل زنجیر بن جاتے ہیں جس کی تمام کڑیاں باہم ملی ہوئی نظر آتی ہیں،" (ص ۶۸)

قدیم مرثیوں میں ردیف کا بہت کم التزام ہوتا تھا، قافیے ہی قافیے ہوتے تھے، میر صاحب نے ردیف کا گویا التزام کر لیا، آج کل جو لوگ انگریزی شاعری کی کورانہ تقلید کرتے ہیں، وہ تو سرے سے قافیے ہی کو بیکار کہتے ہیں، ردیف کا کیا ذکر ہے، شاید انگریزی زبان کی ساخت اسی قسم کی ہو، جیسا کہ عربی میں ردیف نہایت بدنما معلوم ہوتی ہے، لیکن فارسی اور اردو میں تو ردیف قافیہ اور نغمہ کا کام دیتی ہے، جس طرح

راگ میں تال نہ ہو تو بدمزہ ہے، یہی حالت اردو شعر کی ہے، البتہ ردیف کے التزام
کے لیے بہت بڑا قادر الکلام ہونا ضروری ہے، ورنہ ردیف کے التزام کے ساتھ آمد
اور بے ساختگی قائم نہیں رہتی، لیکن اگر یہ خوبی ہاتھ سے نہ جانے پائے تو ردیف سے
شعر چمک جاتا ہے۔ (ص ۴۸-۴۹)

تینوں اقتباسات شاعری کے چند ایسے بنیادی امور پر روشنی ڈالتے ہیں، جن کی طرف
یا تو قدیم تنقید نے توجہ نہیں دی یا جدید تنقید نے غلط رویہ اختیار کیا۔ علامہ شبلی دونوں انتہاؤں
کے درمیان ایک جادۂ اعتدال کی نشاندہی کرتے ہیں، پہلے دو اقتباسات میں شعر کے اندر
الفاظ کی ترتیب اور نظم میں تسلسل بیان کے جو تصورات پیش کیے گئے ہیں، وہ شاعری کی جدید
تنقید کے افکار کی یاد دلاتے ہیں، اور کہیں پیش گوئی کرتے ہیں، شعر کے الفاظ کی نثری ترتیب کا
نظریہ عصر حاضر میں بہت زور و شور کے ساتھ انگریزی نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے پیش کیا ہے، جب کہ
اس سلسلے میں علامہ شبلی کے محولہ بالا خیالات برسوں قبل شائع ہو چکے تھے، واقعات کے ذکر میں
تسلسل بیان کا نظریہ اردو میں کلیم الدین احمد نے مغربی تصور ادب سے متاثر ہو کر اس ہنگامہ
آفریں انداز میں پیش کیا کہ تسلسل کی کمی کے سبب غزل کو نیم وحشی اور اردو نظم نگاری کو بالکل
ناقص قرار دے دیا، حالانکہ علامہ شبلی سالہا سال انیس کے کمال شاعری کی تشریح کرتے ہوئے
اس کی وضاحت کر چکے تھے، اس لحاظ سے وہ نہ صرف کلیم الدین احمد بلکہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ
کے بھی پیشرو ہیں، اور کہا جا سکتا ہے کہ اردو اور انگریزی دونوں ناقدین ان کے نقش قدم پر
چلے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کے خیالات میں وہ بصیرت اور توازن نہیں ہے، جو
علامہ شبلی کے افکار میں نمایاں ہے، وہ اپنے بعد آنے والوں کے برخلاف ترتیب الفاظ اور تنظیم
واقعات کو شرط شاعری اور لازمۂ نظم نہیں قرار دیتے، اس لیے کہ ان کا تنقیدی ذوق و شعور



اور ادبی مطالعہ جدید ناقدین سے زیادہ بلند، عمیق اور دبیز ہے، وہ ایک شاعر کے کمال فن کی
تشریح میں اتنا مبالغہ نہیں کرتے کہ شاعری کے دوسرے نمونہ ہائے کمال کو یکسر نظر انداز کر دیں،
اس لیے علامہ شبلی کی رائے معتدل اور منصفانہ ہے، جب کہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور کلیم الدین احمد
کی رائیں غیر معتدل اور نا منصفانہ ہیں۔

تیسرے اقتباس میں عروض اور وزن شعر کی جو زبردست آگہی ہے، وہ شاعری کے ناقدین
کے لیے ایک درس بصیرت ہے اور عصر حاضر کے اردو شعرا کے لیے بہترین ہدایت، جس دانش مندی
کے ساتھ علامہ شبلی نے عربی، انگریزی اور اردو کے اسالیب شاعری کا موازنہ کیا ہے، وہ ادبیات
کے حقیقت پسندانہ تقابلی مطالعے کے لیے ایک نشان راہ ہے، شعریت کی پوری تاثیر کے لیے
ردیف و قافیہ کی اہمیت واضح کر کے انھوں نے صحیح سمت میں رہنمائی کی ہے، یقیناً ان کا تنقیدی
موقف مشرقی ہے، لیکن مشرقی ادبیات کی قدر شناسی کے لیے بہترین نقطۂ نظر یہی ہے، خاص کر
اردو ادب اور اس کی عظیم الشان صنف شاعری کا نتیجہ خیز مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا جانا
چاہیے، بہر حال اس سلسلے میں وہ ردیف کے التزام سے زیادہ زور قافیے کے التزام پر دیتے ہیں،
اگرچہ اردو میں قافیہ و ردیف دونوں کے التزام کو وہ شعریت میں اضافے کا باعث تصور کرتے
ہیں، اس طرح عروض کے معاملے میں بھی علامہ شبلی اپنا زاویۂ نگاہ بصیرت مندانہ توازن کے ساتھ
پیش کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ ادب و شعر کے اسرار و رموز سے کامل طور پر واقف ہیں، اور ہر نکتہ
اس کے تمام مضمرات کو ملحوظ رکھ کر اٹھاتے ہیں،

ان اقتباسات کے علاوہ علامہ شبلی نے مراثی انیس میں منظر نگاری، جذبات نگاری،
واقعہ نگاری اور رزمیہ نگاری کی مثالیں بیان کر کے اول تو مرثیے کا روایتی تصور ہی بدل کر
رکھ دیا، دوسرے اس صنف نظم کی وسعت کا پتہ دیا، تیسرے اردو شاعری میں [illegible]

بہترین نمونے دکھا دیئے، جن کے فقدان کا رونا اردو کے مغرب زدہ ناقدین آج تک رو رہے ہیں، اس طرح علامہ شبلی کی تنقید سے سراغ ملتا ہے کہ اردو ادب میں منظوم المیہ ڈرامے اور رزمیہ دونوں کے عناصر عملی پیمانے پر پائے جاتے ہیں، چنانچہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو مرثیہ عربی، فارسی اور انگریزی مراثی کی طرح محض نوحہ نہیں ہے، بہت بڑی حد تک المیہ اور رزمیہ ہے، جس میں واقعہ نگاری اور منظر نگاری کے حسین مرقعے بھی موجود ہیں، سب سے بڑھ کر جذبات نگاری میں تصویر کشی اور کردار نگاری کا جو کمال انیس نے مراثی میں دکھایا ہے، وہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے، زیر بحث کتاب میں "انسانی جذبات یا احساسات" کے زیر عنوان علامہ شبلی رقم طراز ہیں:

"یہ شاعری کی اصل روح و روان ہے اور اگر مل صاحب کی رائے تسلیم کی جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے، شاعری درحقیقت مصوری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اس قدر دشوار نہیں جس قدر غیر محسوسات اور غیر مادی اشیاء کا نقشہ اتارنا مشکل ہے، ایک درخت کی تصویر کھینچنی ہو تو کسی قسم کی تخئیل اور دیدہ وری کی ضرورت نہیں، ٹہنیاں، پھل، پھول، پتے سب سامنے ہیں اور ہر شخص ان کو محسوس کر سکتا ہے، مصور کا صرف یہ کمال ہے کہ ہر چیز کا پورا نقشہ کھینچ دے، لیکن رنج، غم، جوش، محبت، غیظ، بے قراری، بیتابی، مسرت، خوشی محسوس اور مادی چیزیں نہیں ہیں، آنکھ ان کو محسوس نہیں کر سکتی، البتہ دل پر ان کا اثر ہوتا ہے، لیکن یہ اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا ہے، اس لیے ان کی ہو بہو اور اصلی تصویر اتارنا مشکل ہے،

میر انیس کا اصلی جوہر یہیں آکر کھلتا ہے، اور یہیں ان کی شاعری کی حد ان کے معاصرین سے بالکل الگ ہو جاتی ہے، انسانی جذبات کی سیکڑوں قسمیں ہیں اور پھر ہر ایک کے مختلف



مراتب اور مدارج ہیں، باپ بیٹے کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، یار آشنا کی محبت، آقا اور غلام کی محبت وغیرہ وغیرہ، میر انیس کے مرثیوں میں نہایت کثرت سے ان جذبات اور ان کے مختلف مدارج کا ذکر ہے، لیکن جس جگہ جس چیز کو لیا ہے، اس کمال کے ساتھ اس کی تصویر کھینچی ہے، کہ اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، (ص ۱۰۴-۱۰۵)

اس بیان سے مرثیے میں تمثیلی شاعری کے عناصر پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اردو مرثیہ منظوم تمثیل رسمی طور پر نہ ہونے کے باوجود فی الواقع ایک تمثیلی نظم ہے اور اس میں نظم و تمثیل دونوں کے وہ فنی اجزاء پائے جاتے ہیں، جو اسے بیک وقت ٹریجڈی اور ایپک دونوں کے معیار پر لے آتے ہیں، اس انداز سے اردو میں مرثیہ نگاری کا مطالعہ علامہ شبلی کی تنقید نگاری کا ایک کمال اور کارنامہ ہے،

"موازنۂ انیس و دبیر" میں نظریاتی و اصولی بحثوں سے زیادہ عملی تنقید کی مثالیں ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب درحقیقت ایک عملی تنقید ہے جو ایک پوری صنف سخن اور اس کے اہم ترین شاعر کے کلام پر جزوی و عمومی طور سے ہے، اتنے بڑے پیمانے پر عملی تنقید کی نظیر دنیائے ادب میں مفقود ہے، اس کے علاوہ علامہ شبلی دنیا کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اس پیمانے پر عملی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا، جب کہ انگریزی میں عملی تنقید کے امام آئی۔ اے۔ رچرڈز کا کام بہت بعد کا ہے، اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے یکسوئی اور ہمواری کے ساتھ عملی تنقید کا کام اپنی ادبی زندگی کے ہر دور میں کیا اور اپنی سب سے بڑی تنقیدی دستاویز "شعر العجم" میں بھی عملی تنقید کے نمونے اپنے مخصوص ادبی تصورات کے مطابق پیش کیے، جب کہ آئی۔ اے۔ رچرڈز کے تنقیدی تصورات اس کی زندگی کے مختلف ادوار میں بدلتے رہے، اور آخر تک یہ معمہ حل نہیں ہوا کہ وہ لفظ و معنی میں کس کی اہمیت کا زیادہ قائل تھا، اس لیے تنقیدی بیانات میں کافی تضاد ہے،

گرچہ اس کی وضاحتیں بھی کی گئی ہیں، بہرحال یہ بات اپنی جگہ ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے عملی تنقید کے معاملے میں وہ رچرڈز کے پیش رو ہیں اور اس طرز تنقید کے نمونے انھوں نے زیادہ صراحت و کثرت سے پیش کیے ہیں، لہذا اردو کے جدید ترین ناقدوں کو رچرڈز سے پہلے اور زیادہ علامہ شبلی کا مطالعہ کرنا چاہیے، تب ہی ان پر مشرقی اور آفاقی تنقید دونوں کے راز کھل سکیں گے، نیز انھیں اپنی تنقیدی روایات کی گراں مایگی کا احساس ہوگا، جس کے بغیر وہ ایک خلا میں معلق ہیں اور بے جڑ کے پودے بن گئے ہیں،

شعر العجم کے حصۂ اول میں علامہ شبلی نے شاعری کے تنقیدی تصور پر جو بحث اٹھائی ہے اس کی تفصیل و تکمیل انھوں نے حصۂ چہارم میں کی ہے، اس حصے کا پورا باب اول شاعری کے متعلق اصولی و نظریاتی مباحث پر مشتمل ہے، جس کا کچھ اندازہ مندرجۂ ذیل سرخیوں پر ایک نظر ڈالنے سے بھی ہو سکتا ہے،

شاعری کی حقیقت، شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں، محاکات یعنی شاعرانہ مصوری کی تعریف، تخئیل کی حقیقت، تشبیہ اور استعارہ، جدت اور لطف ادا، حسن الفاظ، معنی کے لحاظ سے الفاظ کا اثر، سادگی ادا، جملوں کے اجزا کی ترکیب، واقعیت اور اصلیت،

ان میں بعض موضوعات پر ضمنی اور جزوی طور پر سوانح مولانا روم اور موازنۂ انیس و دبیر میں بھی اظہار خیال کیا جا چکا ہے، لیکن مستقل و مکمل بحث زیر تبصرہ باب میں کی گئی ہے، مذکورۂ بالا عنوانات میں سے "شاعری کے اصلی عناصر کیا ہیں" کا عنوان ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے، لہذا اسے ذیل میں بہ تمام و کمال نقل کیا جاتا ہے۔

"ایک عمدہ شعر میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں، اس میں وزن ہوتا ہے، محاکات ہوتی ہے، یعنی کسی چیز یا کسی حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے، خیال بندی ہوتی ہے، الفاظ



سادہ اور شیریں ہوتے ہیں، بندش صاف ہوتی ہے، طرز ادا میں جدت ہوتی ہے، لیکن یہ کیا یہ سب چیزیں شاعری کے اجزا ہیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک ایسی چیز ہے، کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شعر شعر نہیں ہوتا؟ اگر ایسا نہیں ہے اور قطعاً نہیں ہے تو ان تمام اوصاف میں خاص ان چیزوں کو متعین کر دینا چاہیے، جن کے بغیر شعر شعر نہیں رہتا، عام لوگوں کے نزدیک یہ چیز وزن ہے، اس لیے عام لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں، لیکن محققین کی یہ رائے نہیں، وہ وزن کو شعر کا ایک ضروری جز سمجھتے ہیں، تاہم ان کے نزدیک وہ شاعری کا اصل عنصر نہیں ہے،

ارسطو کے نزدیک یہ چیز محاکات یعنی مصوری ہے، لیکن یہ بھی صحیح نہیں، اگر کسی شعر میں تخیل ہو اور محاکات نہ ہو تو کیا وہ شعر نہ ہوگا؟ سیکڑوں اشعار ہیں جن میں محاکات کے بجائے صرف تخئیل ہے اور باوجود اس کے وہ عمدہ اشعار خیال کیے جاتے ہیں، شاید کہا جائے کہ محاکات ایسا وسیع مفہوم ہے کہ تخئیل اس کے دائرہ سے باہر نہیں جا سکتی، اس لیے تخئیل بھی محاکات ہے، لیکن یہ زبردستی ہے، آگے چل کر جب ہم محاکات اور تخئیل کی تعریف لکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، گو یہ ممکن ہے کہ بعض مثالوں میں دونوں کی سرحدیں مل جائیں، حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے، محاکات اور تخئیل، ان میں سے ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا مستحق ہوگا، باقی اور اوصاف یعنی سلاست، صفائی، حسن بندش وغیرہ شعر کے اجزائے اصلی نہیں، بلکہ عوارض اور مستحسنات ہیں، (ص ۷-۹)

شاعری کے عناصر اصلی کا یہ بہترین تجزیہ ہے جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی اردو تنقید میں کیا گیا، اگر اس تجزیے کا موازنہ مقدمہ شعر و شاعری جیسا "شعر کے لیے کیا کیا

شرطیں ضروری ہیں" کے زیر عنوان مولانا حالی کی بحث سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سب سے زیادہ زور سادگی، اصلیت اور جوش پر دیتے ہیں، جب کہ علامہ شبلی سادگی ادا، واقعیت اور اصلیت کی اہمیت کا اقرار کرنے کے باوجود ان چیزوں کو شعر کے اجزائے اصلی نہیں تسلیم کرتے، اس لیے کہ ان کے خیال میں شاعری کے عناصر ترکیبی محاکات اور تخئیل ہیں، شعریت کے سلسلے میں تخئیل کی تعریف "مولانا حالی بھی کرتے ہیں، مگر وہ جب "شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں" کا بیان شروع کرتے ہیں، تو سادگی، اصلیت اور جوش سے آگے نہیں بڑھتے، سادگی اور اصلیت کے تصورات یقیناً علامہ شبلی اور مولانا حالی کے درمیان مشترک نظر آتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کون ان تصورات کو کتنی اہمیت دیتا ہے، علامہ شبلی انھیں "مستحسنات" سمجھنے کے باوجود محض "عوارض" قرار دیتے ہیں اور مولانا حالی شعر کی شرطیں بتانے کے بعد ان باتوں کو مطلق خوبیوں میں شامل کر لیتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ دونوں نے شاعری کے معاملہ میں سادگی اور اصلیت کا جو ذکر کیا ہے وہ بجائے خود صرف ان کے عہد کی ترجیحات پر دلالت کرتا ہے، اور یہ ترجیحات مغربی بالخصوص انیسویں صدی کی انگریزی تنقید کے افکار کے اثرات کی نشان دہی بھی کرتی ہیں، مولانا حالی نے تو اپنی بحث کا آغاز ہی ملٹن کے حوالے سے کیا ہے، بہرحال قابل لحاظ امر یہ ہے کہ علامہ شبلی مغربی افکار پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں، یہاں تک کہ ارسطو سے اختلاف کرتے ہوئے محاکات پر تخئیل کو فوقیت دیتے ہیں، اس سے علامہ شبلی کی مجتہدانہ بصیرت کا پتہ چلتا ہے، یہ بصیرت اس مشرقی انداز فکر کی دین ہے، جو ان کے ذہن میں مولانا حالی سے زیادہ راسخ تھا، اسی انداز فکر نے ان کو اپنے دور میں، جو مغرب کے عام ذہنی غلبے کا تھا، ایک آزاد نظر اور دور رس نگاہ عطا کی تھی، یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کے طرز تنقید کی اہمیت زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے،



مغربی اثرات کی فضا میں علامہ شبلی و مولانا حالی کے ذہنوں کی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے شاعری کے سلسلے میں وزن، قافیہ اور ردیف کے سوالات پر دونوں ناقدوں نے جو اظہار خیال جس طریقے سے کیا ہے اس کا تقابلی مطالعہ بہت مفید ہوگا، وزن و قافیہ و ردیف کی مشکلات کے باوجود ان کی خاص خوبیوں کے دونوں قائل ہیں، لیکن مولانا حالی کی نگاہ میں قافیہ و ردیف کی وہ اہمیت نہیں جو علامہ شبلی کی نگاہ میں ہے، صنائع و بدائع کی طرح قافیے کی گراں باری کا ذکر جس انداز سے مولانا حالی کرتے ہیں علامہ شبلی نہیں کرتے، بلکہ آخر الذکر دشواریوں کے باوجود قافیے کے ساتھ ساتھ ردیف کی بھی بعض خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں، دونوں کے خیالات میں اس فرق سے نہ صرف علامہ شبلی کی زیادہ گہری مشرقیت کا سراغ ملتا ہے بلکہ شعر و شاعری کے حقیقی تقاضوں کے پختہ تر ادراک کا ثبوت بھی مہیا ہوتا ہے،

مولانا حالی و علامہ شبلی کے انداز نظر کا فرق لفظ و معنی کی بحث سے بھی ظاہر ہے، الفاظ کی اہمیت کے دونوں قائل ہیں اور معانی سے کوئی صرف نظر نہیں کرتا، لیکن لفظ و معنی کے ارتباط اور معنی کی تقدیم پر جو تاکیدی نشان علامہ شبلی لگاتے ہیں وہ مولانا حالی نہیں لگاتے، حالانکہ بعض حلقوں میں تصور کیا جاتا ہے کہ مولانا حالی معنی کے علمبردار ہیں اور علامہ شبلی لفظ کے، اس سلسلے میں دونوں ناقدوں کے حسب ذیل بیانات کا تجزیہ و موازنہ کیا جانا چاہیے،

"ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اس قدر معانی پر نہیں، معنی کیسے ہی بلند اور لطیف ہوں اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہیں کیے جائیں گے ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے اور ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابل تحسین ہو سکتا ہے،" (ص ۹۵، مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ ڈاکٹر محمد علی زیدی، ۲،۷)

"شاعری کا اصلی مدار الفاظ کی معنوی حالت پر ہے، یعنی معنی کے لحاظ سے الفاظ کا کیا

اثر ہوتا ہے اور اس لحاظ سے ان میں کیوں کر اختلاف مراتب ہوتا ہے، ہر زبان میں مترادف الفاظ ہوتے ہیں جو ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں لیکن ہر لفظ کے مفہوم اور معنی میں کوئی ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں پائی جاتی ..... اس لیے شاعری نکتہ دانی یہ ہے کہ جس مضمون کے ادا کرنے کے لیے خاص جو لفظ موزوں اور مخصوص ہے وہی استعمال کیا جائے۔" (ص ۸۱ - ۸۲ شعر العجم جلد چہارم، طبع سوم ۲۳)

علامہ شبلی کی تنقیدی بصیرت اس معاملے میں یہ ہے کہ وہ خود الفاظ کی تاثیر میں معنی کی خصوصیت کا پہلو تلاش کرتے ہیں، جب کہ مولانا حالی نسبتہً اس بصیرت کی کمی کے سبب نہ صرف یہ کہ معنی کی تاثیر کو الفاظ کی عمدگی کے ساتھ مشروط کر دیتے ہیں بلکہ الفاظ کی پاکیزگی کو مبتذل مضمون تک کی تحسین کے لیے کافی سمجھتے ہیں،

لفظ و معنی کی بحث میں دونوں ناقدین کے درمیان اس فرق کے باوجود قدرے حیرت کی بات ہے۔ کہ علامہ شبلی تو شعر العجم کی چوتھی جلد میں باضابطہ تشبیہ و استعارہ کا عنوان قایم کر کے دونوں کو محاسن شعر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ "استعارہ دراصل فطری طرز ادا ہے" (ص ۶۱) جب کہ مولانا حالی اول تو مقدمۂ شعر و شاعری میں تشبیہ و استعارہ کا کوئی عنوان قایم ہی نہیں کرتے، دوسرے "جھوٹ اور مبالغہ سے بچنا چاہیے" کی اخلاقی تلقین کرتے ہوئے (ص ۹۴) "نیچرل شاعری" (ص ۹۶) کی تشریح و تفصیل اس طرح کرتے ہیں کہ تشبیہ و استعارہ گویا محض تکلف و تصنع بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا حالی "زمانہ کا اقتضا اور علوم و فنون کی ترقی جو آج کل دنیا میں ہو رہی ہے" جیسی غیر متعلق اور عارضی قسم کی باتوں کا حوالہ دیتے ہیں اور اپنے خیالات کا جواز رجحان زمانہ اور وقتی ضروریات میں تلاش کرتے ہیں، لیکن اپنے وقت اور زمانے کے تقاضوں اور اجتماعی ضروریات سے بہت زیادہ واقف ہونے کے باوجود ادبی



تنقید میں علامہ شبلی صرف مستقل اصول و اقدار پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ادب اور سماج دونوں کے متعلق علامہ شبلی کے افکار زیادہ بالیدہ تھے اور وہ فن اور زندگی دونوں میں جمالیات و اخلاقیات کے توازن کا زیادہ گہرا شعور رکھتے تھے،

تشبیہ و استعارہ کے موضوع پر مولانا حالی کی مماثلت محمد حسین آزاد سے ہے، آب حیات میں برج بھاشا پر عربی اور فارسی زبانوں نے کیا کیا اثر کیے" کے عنوان سے اردو زبان کے ارتقا پر گفتگو کرتے ہوئے وہ تشبیہ و استعارہ کی بعض خوبیاں تسلیم کرتے ہوئے بھی تاسف کرتے ہیں،

"اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا کہ انھوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے لہکتا تھا، مفت ہاتھ سے پھینک دیا، وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر اور اظہار اصلیت، ہمارے نازک خیال اور باریک بیں لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبت لفظی کے ذوق و شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے اور اصلی مطالب کے ادا کرنے میں بے پروا ہو گئے، انجام اس کا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا، (ص )

یہ ایک لسانیاتی مطالعہ ہے جس میں ادبی مطالعے کا جوہر مفقود ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں لسانی حقائق کا بھی کوئی وسیع و عمیق شعور نہیں، بہر حال آزاد کے الفاظ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معنوی اعتبار سے مولانا حالی کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، دونوں کے درمیان اس معاملے میں جو اشتراک خیال ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ آزاد کی طرح مولانا حالی کا ادبی مطالعہ بھی کچھ لسانیاتی قسم کا ہے، لہذا ادب بالخصوص شاعری کے اسرار و رموز کی وہ آگہی اس میں بہت کم ہے جس سے علامہ شبلی کا تصور ادب و شعر مالا مال ہے،

(باقی)

# مشرقی علوم کی قدیم ترین یونیورسٹی

## مدرسۂ عالیہ رام پور

از

جناب محمد شعائر اللہ خاں صاحب رامپور

مدرسہ عالیہ رام پور اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں نواب فیض اللہ خاں (م ۱۷۹۴ء) کے عہد میں مشرقی علوم کی مرکزی درسگاہ کی حیثیت سے ۱۷۷۴ء میں قائم ہوا، اس کا شمار غیر منقسم ہندوستان کی ۱۸۵۷ء سے قبل کی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے،[1]

**مدرسہ کی عہد بعہد تاریخ** یہ مدرسہ رام پور میں محلہ مدرسہ کہنہ پر قائم ہوا، اس کے پہلے صدر مدرس مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی (م ۱۲۲۵ھ) مقرر ہوئے، جنھیں شاہ جہاں پور سے بلایا گیا تھا،[2] انھوں نے مسند درس و تدریس پر رونق افروز ہو کر درس نظامی کو اس کے نصاب تعلیم کی حیثیت سے جاری کیا،[3] ان کے علمی فیض سے کثیر جماعت فیضیاب ہوئی، اس کے بعد مدرسہ دارانگر (متصل نجیب آباد) سے ملا محمد حسن لکھنوی بھی نواب فیض اللہ خاں صاحب کے ایما پر یہاں تشریف لے آئے اور اپنا سلسلۂ درس جاری کیا،

اس زمانہ میں درس و تدریس کے میدان میں دو علمی خانوادے اپنے علم و فضل کی روشنی سے سرزمین ہند کو منور کر رہے تھے، ایک دہلی کا خانوادہ شاہ ولی اللہ محدث، جو علم حدیث کے میدان میں بے مثال خدمت انجام دے رہا تھا اور جو تمام محدثین ہند کی اسناد کا مرکز و منتہیٰ بنا ہوا تھا، دوسرا علمائے فرنگی محل کا خاندان تھا جو علم معقول و منقول میں لاثانی



شہرت کا حامل تھا، رام پور وہ خوش قسمت شہر تھا کہ یہاں ایک طرف تو علمائے فرنگی محل کے اثر سے معقولات کا دریائے علم جاری تھا، اور دوسری طرف خانوادۂ ولی اللہی کے فیض یافتہ علماء مولوی سلام اللہ رام پوری[1] و مولانا نور الاسلام رام پوری وغیرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا درس دے رہے تھے، گویا رام پور علم معقول اور علم منقول (حدیث) کا سنگم بن گیا تھا، اسی لیے وہ اس وقت "بخارائے ہندی" کے نام سے مشہور تھا،

مولانا بحرالعلوم ۱۷۷۴ء میں یہاں آئے تھے، اور پانچ برس رہے،[2] ان کے ساتھ کثیر طلبہ کی جماعت بھی باہر سے آئی تھی، ان کے اور مولانا کے مصارف نواب فیض اللہ خاں صاحب برداشت نہ کر سکے، اس لیے وہ ۱۷۷۹ء میں رام پور سے چلے گئے،[3] اور ملا محمد حسن صاحب کو مدرسہ کا صدر مدرس بنا دیا گیا،

مدرسہ عالیہ ابھی تک محلہ مدرسہ کہنہ پر ہی تھا کہ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۵ء میں محمد یار خاں امیر پسر نواب علی محمد خاں (م ۱۷۴۹ء) کا انتقال ہو گیا اور انھیں مدرسہ ہی میں دفن کیا گیا، یہ مدرسہ کے اندر پہلی تدفین تھی، اس کے بعد ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں ملا محمد حسن لکھنوی کی وفات ہوئی، اور انھیں بھی مدرسہ ہی میں دفن کیا گیا، ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں نواب محمد علی خان ابن فیض اللہ خاں کا ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں اور محمد قیام الدین قائم چاند پوری کا انتقال ہوا تو ان حضرات کو بھی یہیں پر دفن کیا گیا، رفتہ رفتہ یہ مدرسہ مخصوص قبرستان کی شکل میں تبدیل ہو گیا، ظاہر ہے کہ اس کے بعد یہ مسئلہ درپیش ہوا ہوگا کہ مدرسہ کو کہاں لے جایا جائے تاکہ اس کا وقار اور حیثیت برقرار رہے، قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲۰۹ھ کے بعد مدرسہ عالیہ کو محل سرا محمد یار خاں امیر میں منتقل کر دیا گیا،[4] یہ محل سرا پہلے کرم خاں رنڑ کی حویلی کے طور پر مشہور تھی،[5] بعد کو یہ امتداد زمانہ کی نذر ہو گئی، یہ حویلی جس جگہ تھی، وہاں آج کل قلعۂ معلّیٰ کے اندر غیر ملکی رجسٹریشن آفس واقع ہے، اس محل سرا

[1] معارف، مولوی سلام اللہ رامپوری شیخ عبدالحق محدث کی اولاد میں تھے،

میں مدرسہ ایک مدت تک رہا اور مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا عبدالحق خیر آبادی جیسے اکابر کے دریائے علم سے تشنگانِ علم سیراب ہوتے رہے۔

تقریباً ۱۸۸۹ء میں یہ محل سرا بھی قابل درس نہیں رہی، اس لیے مدرسہ ظفر منزل میں منتقل ہوگیا[۸]، جو کوٹھی حیدر علی خاں کے نام سے مشہور تھی، آج کل اسی جگہ مسٹن گنج (غلہ منڈی) واقع ہے[۹]۔ اس مقام پر مولانا ہدایت علی بریلوی، مولوی حفیظ اللہ بندوی (ضلع اعظم گڈھ) جیسے مشاہیر فن نے اپنے علم وکمال سے لوگوں کو بہرہ ور کیا، اور مولانا وزیر محمد خان رامپوری (م ۱۹۲۵ء) اور مولانا عبدالقادر رائے پوری (م ۱۹۶۲ء) جیسے نیک نفسوں نے علمی منازل طے کیں۔

جنوری ۱۸۹۰ء میں مدرسہ عالیہ کی ایک شاخ "رکن عالیہ"[۱۰] کے نام سے محلہ تھوٹر[۱۱] میں قائم ہوئی، جس میں اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست کیا گیا، اس کے قیام کا یہ مقصد تھا کہ یہاں سے ابتدائی کتب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبہ مدرسہ عالیہ میں داخل ہوں، اس شاخ کا پتہ ۱۹۰۰ء تک چلتا ہے، اس کے بعد کے ریاست گزٹ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں اس کا وجود ختم ہوگیا تھا۔

۱۸۹۵ء میں پھر مدرسہ عالیہ کو ظفر منزل سے منتقل ہونا پڑا، اس بار اس کو جامع مسجد (تعمیر شدہ ۱۷۷۵ء) کے کمروں میں جگہ ملی[۱۲]، یہ جامع مسجد آج کی موجودہ جامع مسجد (تعمیر شدہ ۱۹۱۳ء) سے وسعت میں کم تھی اور اس کے دائیں پہلو میں جامع مسجد فیض اللہ خانی (تعمیر شدہ ۱۷۸۸ء) واقع تھی، جامع مسجد کے آنگن میں دائیں اور بائیں جانب کمرے بنے ہوئے تھے، انہی کمروں میں درس ہوتا تھا، کچھ کمروں میں بیرونی اساتذہ مثلاً مولانا نادر الدین ملتانی مرحوم قیام پذیر بھی تھے[۱۳]، اوقات درس میں یہاں عام لوگوں کی آمد ممنوع تھی، لیکن مدرسہ کے معائنہ یا کسی



مخصوص ضرورت سے جامع مسجد میں آنے والوں کے لیے کوئی پابندی نہ تھی[۱۴]۔ اس دور میں مولانا عبدالحق خیر آبادی اور مولانا اسد الحق خیر آبادی (پسر مولانا عبدالحق صاحب) نے کچھ عرصہ تک صدر مدرس رہے، مگر زیادہ مدت تک مولوی محمد طیب مکی اور مولوی سید عبدالعزیز صاحب وغیرہ صدر مدرسی کے منصب پر فائز رہے، اس وقت کے طالب علموں میں نیاز فتح پوری کا نام قابل ذکر ہے۔

یہ دور نواب حامد علی خان (م ۱۹۳۰ء) کا تھا، نواب صاحب کو نئی عمارتوں کے علاوہ پرانی عمارتوں کو از سر نو تعمیر کرانے کا بڑا شوق تھا، لہٰذا وہ نواب کلب علی خان (م ۱۸۸۷ء) کی تعمیر کردہ جامع مسجد کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور اس کے انہدام کا حکم دیدیا، حالانکہ بزرگوں کا بیان ہے کہ جامع مسجد کی نئی تعمیر کی سرے سے کوئی ضرورت نہ تھی، اس کے نتیجہ میں مدرسہ کو بھی ۱۹۱۲ء کے وسط میں کوٹھی صاحبزادہ احمد رضا خان (عرف پیارے صاحب) میں منتقل کیا گیا[۱۵]، یہ کوٹھی گنج قدیم (شیخ کا پھڑ) پر واقع تھی، جہاں آج کل مغربی پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھی آباد ہیں، یہاں منتقل ہونے کے بعد ۱۰ ارمئی ۱۹۱۲ء کو مدرسہ کا پہلا سالانہ جلسہ تقسیم انعام ہوا، اس کی صدارت صاحبزادہ مصطفیٰ علی خاں شرر ہوم سکریٹری ریاست رامپور نے کی تھی، جلسہ میں مدرسہ کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالی گئی اور مستقبل کی ترقی کے بارے میں حکومت کے عزائم کا تذکرہ کیا گیا[۱۶]۔

یہاں ۳۷ برس تک مدرسہ مسلسل چلتا رہا اور اس مدت میں بہت سے پر وقار اشخاص نے اس کے عہدۂ صدر مدرسی کو زینت بخشی، ان قابل ذکر حضرات میں مولانا فضل حق رامپوری، مولانا ظہور الحسین مجددی، مولانا عبدالودود وندوی بھیراجپوری، شمس العلما عبدالرحمٰن بے پوری اور مولوی سید محمد داؤد زنگی پوری شامل ہیں، اس جگہ کے قابل ذکر طلبہ میں مولانا وجیہ الدین احمد خان، مولانا ابو الوفا شاہجہانپوری، مولانا محمد یوسف خاں، مولوی عبدالوہاب خاں، مولانا

امتیاز علی خاں عرشی، مولانا عبدالسلام خاں رام پوری وغیرہ شامل ہیں،

یکم جولائی ۱۹۴۹ء کو ریاست رام پور کا انضمام (MERGES) متحدہ ہندوستان میں ہوگیا، تمام محکمے شکست کردیئے گئے اور سارا نظام عمل منتشر ہوگیا، محکموں کی شکست وریخت کے سبب بہت سی عمارتیں خالی ہوگئیں، خود نواب رضا علی خاں (م ۱۹۶۶ء) نے بھی قلعۂ معلّٰی کے بجائے کوٹھی خاص باغ میں رہائش اختیار کی، اس طرح قلعہ بھی خالی ہوگیا، اس وقت مدرسہ عالیہ کے لیے مچھلی بھون (اندرون قلعہ) کی عمارت تجویز کی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس کو مشرقی علوم کی یونیورسٹی کے طرز پر ترقی دی جائے گی، مرجرا ایکٹ میں اس کے لیے ایک شق بھی رکھی گئی، لیکن مدرسہ کے ارباب اختیار نے مچھلی بھون کی عمارت کو لینا اپنی شان کے موافق نہ سمجھا اور مدرسہ کو اگست ۱۹۴۹ء کے وسط میں کطب گھر کی عمارت میں منتقل کردیا گیا، اور اس کا نام بھی بدل کر اورنیٹل کالج رام پور (ORIENTAL COLLEGE RAMPUR) کردیا گیا،

افسوس کہ وہ مدرسۂ عالیہ جس میں بہ یک وقت مختلف ملکوں کے چار سو[۴۰۰] سے لے کر پانچ سو[۵۰۰] تک طلبہ زیر تعلیم رہا کرتے تھے، اور جس میں فرنگی محل، خیرآباد اور رام پور کے اساتذۂ عصر تعلیم دیتے تھے، آج ان لوگوں سے خالی ہوچکا ہے، نہ اب وہ پڑھانے والے مدرسین رہے اور نہ پڑھنے والے طلبہ، محض نام کا مدرسہ ضرور باقی ہے،

**نظام تعلیم** مدرسۂ عالیہ ہمیشہ سے عربی کی مثالی تعلیم کا مرکز اور درس نظامی کی اعلیٰ یونیورسٹی کے طور پر مشہور رہا، یہاں کے پڑھانے والے اپنے زمانہ کے جامع العلوم ہوتے تھے، تدریس ایک علمی مشغلہ تھی نہ کہ پیشہ، مدرسین ڈوب کر پڑھانے اور طلبہ کو گھول کر پلادینے کے عادی تھے، اسی کا یہ اثر ہوتا تھا کہ طالب علم بھی مثالی تیار ہوتے، جن کو دیکھ کر اساتذہ کو رشک ہوتا تھا،



مدرسین کے لیے مدرسہ آنا لازمی نہیں تھا، بلکہ وہ اپنے گھروں پر بیٹھ کر پڑھایا کرتے تھے، درجات کی بھی کوئی قید نہیں تھی کہ کون سا استاذ کس جماعت کو پڑھائے گا، بلکہ مقررہ کتب کا انتخاب کرلیا جاتا اور ہر استاذ منتخب شدہ کتب کا درس دیتا تھا، اساتذہ مدرسین مدرسۂ سرکاری کہلاتے تھے، اور ان کو تنخواہ گھر بیٹھے ملتی تھی، یہ نظام ۱۸۸۹ء سے پہلے کا ہے،

مدرسۂ عالیہ کے نظام تعلیم میں ۱۸۸۹ء میں پہلی بار بڑے پیمانے پر ردوبدل ہوا جبکہ جنرل اعظم الدین خاں ریاست کے مدار المہام اور مختارِ کل تھے، ۱۸۸۷ء میں نواب کلب علی خاں کا جب انتقال ہوگیا تو مشتاق علی خاں مسند نشین ہوئے، وہ بیمار رہا کرتے تھے، اس لیے انھوں نے ریاست کا کل انتظام و انصرام جنرل اعظم الدین خاں (از خاندان نجیب الدولہ) کے سپرد کردیا، ۱۸۸۹ء میں مشتاق علی خاں بھی وفات پاگئے، تب حامد علی خاں رسمی طور پر مسند نشین ہوگئے، مگر چونکہ ان کی عمر کم تھی اس لیے انتظام ریاست کے لیے ایک ریجنسی کونسل قائم ہوگئی، جس کے وائس پریزیڈنٹ اور اصل کار پرواز یہی جنرل صاحب تھے، جنرل صاحب مغربی علوم سے آراستہ اور انگریزی تہذیب کے دلدادہ تھے، اس لیے وہ ہر کام کو نظم و ضبط اور سلیقہ و شائستگی سے کرتے تھے، انھوں نے جدید طریقہ پر تمام محکموں کا بندوبست کرنے کے لیے قواعد و ضوابط بنائے اور اپنے خصوصی اختیارات سے جو بنیادی کام انجام دیے وہ بے مثال ہیں،

جنرل صاحب نے جب مدرسہ عالیہ کی طرف توجہ کی تو اسے اورنیٹل کالج لاہور اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کی سطح پر منضبط کرنے کا پروگرام بنایا، اسکے لیے قواعد و ضوابط وضع کیے، نظام تدریس (TIMETABLE) عمل میں آیا، امتحان لینے کا تحریری ضابطہ رائج ہوا[۲۲]، اس سے پہلے امتحان زبانی ہوا کرتا تھا، نصاب کی اصلاح کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جو مولانا عبدالحق

خیرآبادی کے زیر اثر تھی، اس اصلاح شدہ نصاب کا نفاذ [illegible]ء میں ہوا، معمولی تبدیلیوں کے باوجود نصاب مکمل درس نظامی ہی رہا اور اصلاح کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا، اس لیے ۱۹۰۰ء میں دوسری اصلاحی کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس کے صدر حاجی محمد علی خاں سیشن جج ریاست رامپور تھے، اس کمیٹی کے زیر نظر جو نصاب تیار ہوا وہ ۱۳۱۶ھ/۱۹۰۰ء میں سرکاری پریس رامپور سے ۲۸ صفحات پر شائع ہوا، یہ نصاب بھی درس نظامی ہی سے قریب تر تھا، البتہ اس میں ایک ادب کی شاخ بڑھائی گئی اور دوسری ریاضی کی، ایک اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ صحاح ستہ (حدیث کی چھ صحیح اور معتبر کتابیں (۱) بخاری (۲) مسلم (۳) ترمذی (۴) ابوداؤد (۵) ابن ماجہ (۶) نسائی) کو کسی طرح درس نظامی کا جزء بنایا گیا، حالانکہ اس سے پہلے درجۂ حدیث علیحدہ شکل میں تھا، یہ بات رام پور کے عقلی ونقلی مزاج کے خلاف تھی یہاں کے معقولیوں کا یہ نظریہ تھا کہ طالب علم کو منطق وفلسفہ کے میدان میں مہارت تامہ حاصل ہوجائے، اس کے بعد فقہ پڑھ لی جائے، کیونکہ مسائل سب فقہ میں آجاتے ہیں، حدیث تو صرف تبرکاً پڑھنا چاہیے، اس کے لیے مشکوٰۃ المصابیح پہلے ہی سے موجود تھی،

بہرحال یہ نصاب بھی منظور ہوکر جاری ہوگیا، اس کے ایک سال بعد ہی ۱۹۰۱ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ علوم مشرقی کے امتحانات منشی، منشی عالم اور منشی فاضل کے درجات جاری ہوئے، جو شاداں بلگرامی کی تحریک کا ثمرہ تھے،[۲۴] انہی امتحانات کی وجہ سے مدرسہ میں انگریزی کا عہدہ بھی قائم ہوا،[۲۵] ۱۹۰۸ء میں اہل تشیع کے لیے ان کی دینیات کی تعلیم کا بندوبست بھی کردیا گیا، جس کے لیے الگ ایک عہدہ مدرس دینیات شیعہ کا قائم کیا گیا،[۲۶]

پینتالیس[۴۵] برس بعد ۱۹۴۵ء میں ہی اصلاح نصاب کی تحریک پھر اٹھی، جس کے محرک شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن جے پوری تھے، وہ دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے مدرسۂ عالیہ



رام پور کے پرنسپل ہوکر آئے تھے، موصوف نے ترتیب نصاب کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس میں مولانا وجیہ الدین احمد خان صاحب، مولوی افضال الحق صاحب، مولوی عبدالودود ندوی، مولوی سید احمد شاہ نقوی اور مولوی عبدالسلام خاں صاحب شامل تھے، اس کمیٹی نے نصاب میں کچھ تبدیلیاں کیں، یہ تبدیل شدہ نصاب منظور ہوکر ۱۹۴۶ء میں رائج ہوا،[۲۷]

۱۹۵۹ء میں اصلاح نصاب کی پھر ضرورت محسوس کی گئی اور ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں مولانا امتیاز علی خان عرشی، مولانا وجیہ الدین احمد خان، جناب محمود علی خاں ایم اے اور مولوی عبدالسلام خان صاحب شامل تھے، خارجی اشتراک کے لیے مولانا سعید احمد اکبرآبادی (ایڈیٹر برہان دہلی) اور جناب شبیر احمد خان غوری (انسپکٹر مدارس عربیہ یوپی) کو بھی مدعو کیا گیا، اس کمیٹی نے ایک سال کی مدت میں اپنے مختلف اجلاس کیے اور کافی بحث وتمحیص کے بعد جو نصاب تجویز کیا گیا، وہ مئی ۱۹۶۰ء میں ڈائرکٹر تعلیمات اترپردیش (صدر رام پور مدرسہ عالیہ بورڈ) کو پیش کردیا گیا،[۲۸] لیکن یہ نصاب منظور ہوکر فائلوں کی حد تک محدود رہا۔

اب حال میں یہ خبر بھی ملی کہ نصاب کی کاپی سرکاری فائل سے بھی غائب کردی گئی،

**مصارف** | مدرسۂ عالیہ کے جملہ مصارف وقف کی آمدنی سے پورے کیے جاتے تھے، یہ وقف نواب فیض اللہ خاں کی بیگم نے کیا تھا، اس وقف سے روزمرہ کے اخراجات کے علاوہ طلبہ کو وظائف بھی دیئے جاتے تھے، جو مقامی اور غیر مقامی دونوں طرح کے طلبہ کو ملا کرتے تھے، غیر مقامی میں برما، افغانستان، بخارا، پنجاب اور بنگال کے طالب علم ہوا کرتے تھے، جو مساجد میں قیام کرتے تھے اور ان کے خورد ونوش کا بندوبست محلے کے لوگ کردیتے تھے،[۲۹]

اس مدرسہ کے وقف کی جائداد کے بارے میں مولانا عبدالسلام خاں صاحب فرماتے ہیں،

" نواب فیض اللہ خاں کی بیگم نے کچھ متعین گاؤں کی آمدنی وقف کی، اس کا جو وقف نامہ

تھا وہ ۱۹۳۰ء تک دار الانشا (PORITICAL RECORD OFFICE) میں محفوظ تھا، اس میں واقفہ کے نام کے ساتھ گانووں کے نام اور ان کی موقوفہ آمدنی کی تفصیلات درج تھیں، چنانچہ ۱۹۳۰ء کی کسی تاریخ کے روزنامہ زمیندار لاہور میں مدرسہ عالیہ کے متعلق جو مضمون شایع ہوا تھا، اس میں اسی وقف نامے کو دیکھ کر واقفہ کا نام شایع کرایا گیا تھا،[۳۰]

کلب علی خاں فائق رام پوری لکھتے ہیں:۔

"نواب فیض اللہ خاں نے تحصیل شاہ آباد میں اس مدرسہ کے مصارف کے لیے دو گانوں وقف کر رکھے تھے، اس لیے مدرسہ کے دفتر کے ذمہ دار کو متولی کہا جاتا تھا، نواب کلب علی خاں کے عہد میں صیغۂ اوقاف سے ہی مدرسہ عالیہ کے مصارف کے لیے رقم ملتی تھی،[۳۱]

میں نے اس سلسلہ میں کافی تحقیق کی لیکن ہنوز کوئی تسلی بخش کیفیت سامنے نہیں آئی، تحصیل شاہ آباد (ضلع رام پور) کے نام کا جب سراغ لگا تو میں نے "حالات دیہی موضع دار تحصیل شاہ آباد" کا مطالعہ کیا، اس میں بھی اس وقف کے بارہ میں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا، البتہ ایک گانوں بیگم گنج کے بارے میں یہ تفصیل موجود ہے،

"موضع بیگم گنج جناب نواب صاحب فیض اللہ خاں بہادر کے عہد میں آباد ہوا تھا اور جناب بیگم صاحبہ نے اپنے نام پر نام رکھا تھا، کچھ روز آباد رہا، بعد کو ویران ہوگیا،[۳۲]

اس تحریر سے یہ بھی اشارہ نہیں ملتا کہ وقف شدہ گانوں بیگم گنج ہی تھا یا کوئی دوسرا گانوں تھا، لیکن یہ طے شدہ امر ہے کہ وقف کی جائداد بہت کچھ تھی، جو ۱۹۳۰ء کے بعد وقف نامہ چوری ہوجانے کے باعث خرد برد کر دی گئی،



اس جائداد کے باعث مدرسہ کے دفتر کے ذمہ دار کو متولی کہتے تھے، جس کے ذمہ دفتر کے کاموں کے علاوہ مدرسہ کا کل اسباب وکتب خانہ بھی رہتا تھا، سارے کاغذات اور ان کی خانہ پری متولی کے ذمہ ہی تھی،

آخر میں مندرجہ ذیل فہرست پیش خدمت ہیں،

فہرست متولیان مدرسہ

| نمبر شمار | نام | عہدہ | تفصیل |
|---|---|---|---|
| ۱ | مولوی سید غلام حضرت، | متولی | بعہد یوسف علی خاں (۱۸۵۵ء تا ۱۸۷۰ء) |
| ۲ | مولوی عبد العزیز خاں صواتی، | ,, | ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ آپ کا تقرر ہوا، |
| ۳ | سید سعید الدین | ,, | آپ کا تقرر ۱۸۷۴ء میں ہوا، ۱۸۹۳ء میں انتقال ہوگیا، |
| ۴ | مشتاق حسن خاں | نائب متولی | ۱۳ر مارچ ۱۸۸۶ء کو تقرر ہوا، |
| ۵ | سید وحید الدین، | متولی | ۴ر جون ۱۸۹۰ء کو تقرر ہوا، ۱۰ر مارچ ۱۹۱۲ء کو وفات ہوئی، |
| ۶ | سید صدر الدین، | نائب متولی | ۱۴ فروری ۱۹۰۶ء کو تقرر ہوا، ۱۰ر مارچ ۱۹۱۲ء کو متولی ہوئے، ۲ر فروری ۱۹۳۰ء کو انتقال ہوگیا، |
| ۷ | سید صدیق احمد، | نائب متولی | ۸ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو تقرر ہوا، |
| ۸ | سید نظام الدین احمد حسرت کاظمی | متولی | یکم مارچ ۱۹۳۰ء کو تقرر ہوا، دسمبر ۱۹۵۷ء میں ریٹائر ہوگئے، |

فہرست صدر مدرسین (PRINCIPALS)

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱ | مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی | سنہ ۱۷۷۴ء | سنہ ۱۷۷۹ء |
| ۲ | ملا محمد حسن لکھنوی | سنہ ۱۷۷۴ء | سنہ ۱۷۸۴ء |
| ۳ | مولانا غلام جیلانی پھلی بھیتی | سنہ ۱۸۱۹ء سے پہلے | سنہ ۱۸۱۹ء |
| ۴ | مفتی شرف الدین رام پوری | بعد سنہ ۱۸۲۲ء | سنہ ۱۸۵۱ء |
| ۵ | محمد فضل حق خیر آبادی | سنہ ۱۸۴۰ء | سنہ ۱۸۴۸ء |
| ۶ | مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی | سنہ ۱۸۵۶ء | سنہ ۱۸۷۷ء |
| ۷ | محمد عبدالحق خیر آبادی | سنہ ۱۸۶۵ء<br>۱۸۹۶ء | سنہ ۱۸۸۶ء<br>۱۸۹۹ء |
| ۸ | ہدایت علی بریلوی | سنہ ۱۸۸۶ء | سنہ ۱۸۸۹ء |
| ۹ | محمد حفیظ اللہ بندوی (ضلع اعظم گڈھ) | سنہ ۱۸۸۹ء | سنہ ۱۸۹۶ء |
| ۱۰ | محمد اسد الحق خیر آبادی | سنہ ۱۸۹۸ء | سنہ ۱۹۰۰ء |
| ۱۱ | محمد طیب مکی | سنہ ۱۸۹۹ء | سنہ ۱۹۰۸ء |
| ۱۲ | مفتی لطف اللہ رام پوری | سنہ ۱۸۹۹ء | سنہ ۱۹۰۶ء |
| ۱۳ | محمد فضل حق رام پوری | سنہ ۱۸۸۷ء | سنہ ۱۹۴۰ء |
| ۱۴ | سید محمد عبدالعزیز | سنہ ۱۹۱۹ء | سنہ ۱۹۱۹ء |
| ۱۵ | ظہور الحسین مجددی | سنہ ۱۹۱۹ء | سنہ ۱۹۱۹ء |
| ۱۶ | عبدالودود ندوی (جیراجپور اعظم گڈھ) | سنہ ۱۹۴۰ء | سنہ ۱۹۴۷ |
| ۱۷ | عبدالرحمن نجے پوری | سنہ ۱۹۴۴ء | سنہ ۱۹۴۷ء |
| ۱۸ | سید محمد داؤد زنگی پوری | سنہ ۱۹۴۷ء | سنہ ۱۹۵۰ء |



| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱۹ | محسن نواب لکھنوی | سنہ ۱۹۴۹ء | سنہ ۱۹۵۳ء |
| ۲۰ | عبدالمومن فاروقی | سنہ ۱۹۵۳ء | سنہ ۱۹۵۵ء |
| ۲۱ | عبدالسلام خاں رام پوری | سنہ ۱۹۴۴ء | سنہ ۱۹۷۵ء |
| ۲۲ | مولوی تفضل حسین رام پوری | سنہ ۱۹۴۳ء | سنہ ۱۹۷۹ء |
| ۲۳ | نورالدین الہ آبادی | سنہ ۱۹۵۶ء | موجود ہیں۔ |

فہرست اساتذۂ عربی

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱ | ملا سلطان اخوند | تقریباً سنہ ۱۸۰۰ء | — |
| ۲ | مولوی الہ داد طالب شبراتی | بعد سنہ ۱۸۲۰ء | سنہ ۱۸۵۹ء، |
| ۳ | مولوی الہ نور | تقریباً سنہ ۱۸۲۵ء | تقریباً سنہ ۱۸۵۵ء۔ |
| ۴ | مولوی عبدالعزیز خاں صواتی | " سنہ ۱۸۴۰ء | — |
| ۵ | مولوی محمد شاہ صرفی ونحوی | " سنہ ۱۸۴۰ء | — |
| ۶ | مولوی محمود عالم | " سنہ ۱۸۵۰ء | سنہ ۱۸۸۴ء |
| ۷ | مولوی جمال شاہ خاں صرفی ونحوی | " سنہ ۱۸۵۰ء | سنہ ۱۸۸۸ء |
| ۸ | مولوی رفیع اللہ خاں اخوندزادہ | " سنہ ۱۸۵۰ء | — |
| ۹ | مولوی شریف الحسن | " سنہ ۱۸۵۰ء | — |
| ۱۰ | مولوی اعظم شاہ ولایتی | " سنہ ۱۸۵۰ء | سنہ ۱۸۸۴ء |
| ۱۱ | مولوی حکیم مظہر علی | " سنہ ۱۸۵۰ء | سنہ ۱۸۸۰ء |

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱۲ | مولوی ہدایت اللہ خاں جونپوری | تقریباً ۱۸۵۷ء | ۱۸۶۰ء |
| ۱۳ | مولوی معظم شاہ ولایتی، | ″ ۱۸۶۰ء | — |
| ۱۴ | مولوی محمد سیف الدین خاں بلخی | ۱۸۶۸ء | ۱۸۹۶ء |
| ۱۵ | ملا حسن کابلی | — | ۱۸۶۷ء سے پہلے کے مدرس ہیں، |
| ۱۶ | مولوی سید محمد ولی اخونزادہ | — | ۱۸۶۷ء سے پہلے کے مدرس ہیں، |
| ۱۷ | مولوی جمال احمد مجددی | تقریباً ۱۸۶۷ء | ۱۸۸۰ء |
| ۱۸ | مولوی نور النبی | — | ۱۸۷۶-۷ء سے پہلے کے مدرس ہیں، |
| ۱۹ | حکیم عبدالکریم خاں محب | — | ۱۸۸۰ء سے پہلے کے مدرس ہیں، |
| ۲۰ | مولوی نادر الدین ملتانی | تقریباً ۱۸۸۰ء | تقریباً ۱۸۹۵ء |
| ۲۱ | مولوی عبداللہ خاں خانپوری | بعد ۱۸۸۰ء | ۱۹۰۸ء |
| ۲۲ | مولوی امداد حسین خان | — | ۱۸۸۶ء سے پہلے مدرس رہے، |
| ۲۳ | مولوی محمد یعقوب علی خاں طبیب | ۱۸۸۹ء سے پہلے | ۱۸۹۲ء تک نام ملتا ہے، |
| ۲۴ | مولوی ظہور الحسین مجددی | ۱۸۸۷ء | ۱۹۰۸ء |
| ۲۵ | مولوی ارشد علی | ۱۸۹۰ء | ۱۹۱۶ء |
| ۲۶ | مولوی حافظ واحد نور رام پوری | ۱۸۹۰ء | ۱۹۰۰ء |
| ۲۷ | مولوی محمد اسمٰعیل ولایتی | — | ۱۸۹۱ء |
| ۲۸ | قاری علی حسین خاں | ۱۸۹۰ء | ۱۹۱۹ء |
| ۲۹ | مولوی مجاہد الدین بنگالی، | ۱۸۹۱ء سے پہلے | ۱۸۹۴ء تک نام ملتا ہے، |



| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۳۰ | مولوی محمد اعجاز حسین | — | ۱۸۹۱ء سے پہلے مدرس تھے، |
| ۳۱ | مولوی حبیب احمد | — | ۱۸۹۲ء میں نام آیا ہے، |
| ۳۲ | مولوی ابوسفیان | بعد ۱۸۹۴ء | ۱۸۹۸ء |
| ۳۳ | مولوی سید شرافت اللہ | ۱۸۹۵ء | ۱۹۱۲ء تک نام ملتا ہے، |
| ۳۴ | مولوی شفیق الرحمٰن خاں | ۱۸۹۶ء | ۱۸۹۶ء |
| ۳۵ | مولوی وزیر محمد خاں وزیر | ۱۸۹۶ء | ۱۹۲۵ء |
| ۳۶ | مولوی معز اللہ خاں | ۱۸۹۶ء | ۱۹۳۳ء |
| ۳۷ | مولوی ناظر الدین بنگالی | ۱۸۹۷ء کے لگ بھگ ذکر آیا ہے، | |
| ۳۸ | مولوی احمد امین خاں | ۱۸۹۸ء | ۱۹۲۵ء |
| ۳۹ | مولوی احمد نور مدنی | ۱۸۹۸ء | ۱۹۱۲ء |
| ۴۰ | مولوی بشارت اللہ بن مفتی سعد اللہ | ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ مدرس ہوئے تھے، کچھ عرصہ بعد بھوپال چلے گئے، | |
| ۴۱ | مولوی سید امداد حسین، | ۱۹۰۱ء | — |
| ۴۲ | مولوی نظام الدین خان ولایتی | ۱۹۰۲ء | ۱۹۱۹ء، |
| ۴۳ | مولوی ضیاء الدین خاں | ۱۹۰۲ء | ۱۹۱۲ء |
| ۴۴ | مولوی غلام رسول خاں ولایتی | ۱۹۰۸ء | ۱۹۲۹ء کے لگ بھگ۔ |
| ۴۵ | مولوی سید عبدالعزیز | ۱۹۰۰ء | ۱۹۱۰ء |
| ۴۶ | مولوی نظیر الدین امروہوی | ۱۹۰۹ء | ۱۹۳۲ء تک نام آیا ہے، |

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۴۷ | مولوی رشید الدین | سنہ ۱۹۱۰ء | سنہ ۱۹۲۹ء |
| ۴۸ | مولوی محمد افضال الحق (کلاں) | سنہ ۱۹۱۱ء | سنہ ۱۹۴۶ء |
| ۴۹ | مولوی محمد یعقوب | سنہ ۱۹۱۲ء | سنہ ۱۹۱۲ء |
| ۵۰ | مولوی سید رسول قریشی ہزاروی | سنہ ۱۹۱۳ء | سنہ ۱۹۳۸ء تک نام ملتا ہے، |
| ۵۱ | مولوی اشفاق احمد | سنہ ۱۹۱۹ء | سنہ ۱۹۴۶ء |
| ۵۲ | قاری عبد الرحمٰن خاں | سنہ ۱۹۱۹ء | سنہ ۱۹۵۲ء |
| ۵۳ | مولوی محمد یوسف خاں | سنہ ۱۹۲۲ء | سنہ ۱۹۵۴ء |
| ۵۴ | مولوی گل محمود افغانی | سنہ ۱۹۲۶ء سے سنہ ۱۹۳۲ء کے درمیان نام ملتا ہے، | |
| ۵۵ | مولوی محمد نبی خان | سنہ ۱۹۲۹ء سے پہلے | سنہ ۱۹۲۹ء |
| ۵۶ | مولوی امانت حسین | سنہ ۱۹۲۹ء | سنہ ۱۹۳۲ء تک نام ملتا ہے، |
| ۵۷ | مولوی سید محمد یوسف | سنہ ۱۹۲۹ء تک مدرس تھے، | |
| ۵۸ | مولوی سید عبد الدائم جلالی | سنہ ۱۹۲۹ء | سنہ ۱۹۵۴ء |
| ۵۹ | مولوی مرشد علی | سنہ ۱۹۳۱ء میں نام آیا ہے، | |
| ۶۰ | قاری محمد اسمٰعیل مجددی | سنہ ۱۹۳۶ء | سنہ ۱۹۷۱ء |
| ۶۱ | مولوی محمد اللہ خاں عنایتی | سنہ ۱۹۳۶ | سنہ ۱۹۴۴ء |
| ۶۲ | مولوی حامد علی خاں رامپوری ثم ملتانی | سنہ ۱۹۳۸ء<br>سنہ ۱۹۴۷ء | سنہ ۱۹۳۸ء<br>سنہ ۱۹۵۹ء |
| ۶۳ | مولوی عاشق حسین خاں | سنہ ۱۹۳۸ء | سنہ ۱۹۷۳ء |
| ۶۴ | مولوی تفضل حسین | سنہ ۱۹۴۳ء | سنہ ۱۹۷۹ء |



| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۶۵ | مولوی افضال الحق (خورد) | سنہ ۱۹۴۶ء | سنہ ۱۹۶۱ء |
| ۶۶ | مولوی عزیز اللہ خاں | سنہ ۱۹۴۶ء | سنہ ۱۹۸۴ء |
| ۶۷ | مرزا محمد یوسف | سنہ ۱۹۵۴ء | سنہ ۱۹۶۱ء |
| ۶۸ | مولوی عبد السلام صدیقی نگینوی | سنہ ۱۹۵۴ء | سنہ ۱۹۶۸ء |
| ۶۹ | مولوی قاسم علی بجنوری | سنہ ۱۹۵۴ء | تاحال مدرس ہیں، |
| ۷۰ | مولوی عبد القدیر صاحب | سنہ ۱۹۵۶ء | ۳۰ جون سنہ ۱۹۸۶ء |
| ۷۱ | مولوی نظام الدین الہ آبادی | سنہ ۱۹۵۷ء | سنہ ۱۹۶۷ء |
| ۷۲ | مظہر علی خاں | سنہ ۱۹۵۶ء | تاحال مدرس ہیں، |
| ۷۳ | مولوی ثناء اللہ خان | سنہ ۱۹۶۰ء | ۳۰ جون سنہ ۱۹۸۴ء |
| ۷۴ | مولوی سلامت جان خاں | سنہ ۱۹۶۱ء | تاحال مدرس ہیں، |
| ۷۵ | مولوی ثناء اللہ خاں (خورد) | سنہ ۱۹۶۲ء | " " " |
| ۷۶ | مولوی نور الحسن ولایتی | سنہ ۱۹۶۳ء | سنہ ۱۹۶۴ء |
| ۷۷ | مولوی مظفر حسین | سنہ ۱۹۷۵ء | تاحال مدرس ہیں، |
| ۷۸ | مولوی امتیاز احمد ندوی الہ آبادی | | |

## فہرست اساتذۂ فارسی

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱ | مولوی غلام ناصر خاں | عہد محمد سعید خاں ۱۸۵۵ء سنہ ۱۸۴۰ء میں مدرس تھے، | |
| ۲ | مولوی نیاز اللہ نیاز | سنہ ۱۸۷۳ء سے پہلے | سنہ ۱۸۷۹ء، |

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۳ | مولوی حسین شاہ خاں نامی | سنہ ۱۸۷۳ء سے پہلے | سنہ ۱۸۹۴ء |
| ۴ | مولوی ولی محمد خاں بسمل | سنہ ۱۸۷۳ء " " | سنہ ۱۸۹۴ء |
| ۵ | سید عثمان علی عثمان | سنہ ۱۸۷۳ء " " | سنہ ۱۸۹۱ء تک حیات تھے، |
| ۶ | مولوی عبدالرزاق خاں طالب | سنہ ۱۸۸۶ء | سنہ ۱۹۰۱ء |
| ۷ | مولوی کریم اللہ خاں | سنہ ۱۸۸۸ء | سنہ ۱۸۹۶ء (خوشنویس بھی تھے) |
| ۸ | ابوالحمید مولانا فرحی، | سنہ ۱۸۸۷ء | سنہ ۱۸۹۰ء |
| ۹ | مولوی فصیح الزماں خاں فصیح | سنہ ۱۸۸۹ء | سنہ ۱۸۹۳ء |
| ۱۰ | مولوی عبدالمالک | سنہ ۱۸۹۰ء | — |
| ۱۱ | مولوی عطاء اللہ خاں | سنہ ۱۸۹۱ء | — |
| ۱۲ | مولوی سید نثار علی | — | سنہ ۱۸۹۶ء |
| ۱۳ | مولوی سید ارشاد علی | سنہ ۱۸۹۲ء | سنہ ۱۹۱۶ء |
| ۱۴ | مولوی شیخ محمد حسن | سنہ ۱۸۹۴ء | — |
| ۱۵ | مولوی غوث محمد خاں | سنہ ۱۸۹۴ء سے سنہ ۱۸۹۶ء تک نام ملتا ہے، | |
| ۱۶ | مولوی سید یوسف حسن | سنہ ۱۸۹۶ء | سنہ ۱۹۱۹ء |
| ۱۷ | مولوی رشید اللہ خاں | سنہ ۱۸۹۶ء | سنہ ۱۹۳۹ء (خوشنویس بھی تھے) |
| ۱۸ | مولوی شہاب الدین خاں | سنہ ۱۸۹۶ء | سنہ ۱۹۰۷ء |
| ۱۹ | مولوی ظہور الحق | سنہ ۱۸۹۶ء | سنہ ۱۸۹۷ء |
| ۲۰ | مولوی سید اولاد حسین شاداں بلگرامی | سنہ ۱۹۰۱ | سنہ ۱۹۳۸ء |



| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۲۱ | مولوی سید محمد تقی شاداں لکھنوی | سنہ ۱۹۰۱ء | سنہ ۱۹۳۵ء |
| ۲۲ | مولوی مہدی علی خاں | سنہ ۱۹۰۱ء | سنہ ۱۹۰۶ء |
| ۲۳ | مولوی فرخ مرزا | سنہ ۱۹۰۳ء | سنہ ۱۹۴۳ء |
| ۲۴ | مولوی رضوان علی | سنہ ۱۹۰۴ء | سنہ ۱۹۱۴ء (چند دن مدرس رہے) |
| ۲۵ | مولوی امتیاز احمد بے تاب | سنہ ۱۹۰۵ء میں نام آیا ہے، | |
| ۲۶ | مولوی سید فرزند علی | سنہ ۱۹۰۷ء | سنہ ۱۹۲۸ء |
| ۲۷ | مولوی سعادت علی خاں | سنہ ۱۹۱۶ء | سنہ ۱۹۳۲ء |
| ۲۸ | مولوی سید باقر حسین | سنہ ۱۹۱۸ء میں نام آیا ہے، | |
| ۲۹ | مولوی سید محمد حسن | بعد سنہ ۱۹۱۹ | قبل سنہ ۱۹۳۲ء |
| ۳۰ | مولوی عبدالرؤف خاں | سنہ ۱۹۲۴ء | بعد سنہ ۱۹۳۲ء |
| ۳۱ | مولوی اختر حسین | سنہ ۱۹۲۸ء | سنہ ۱۹۳۲ء |
| ۳۲ | مولوی عبدالحکیم خاں | سنہ ۱۹۳۱ء سے پہلے | سنہ ۱۹۴۶ء |
| ۳۳ | مولوی سید عبدالسلام | سنہ ۱۹۳۳ء | سنہ ۱۹۷۲ء |
| ۳۴ | مولوی تسخیر احمد | سنہ ۱۹۳۶ء | سنہ ۱۹۳۶ء (چند دن مدرس رہے) |
| ۳۵ | مولوی سرور الدین | سنہ ۱۹۳۶ء | سنہ ۱۹۳۸ء |
| ۳۶ | انیس حسن بیگ | سنہ ۱۹۳۸ء | سنہ ۱۹۶۵ء |
| ۳۷ | سید حامد شاہ شادمانی | سنہ ۱۹۳۴ء | سنہ ۱۹۸۰ء |
| ۳۸ | مولوی ابوالقاسم مجددی | سنہ ۱۹۴۶ء | سنہ ۱۹۶۸ء |

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۳۹ | منشی احمد بخش ابر احسنی گنوری | ۱۹۴۷ء | ۱۹۵۳ء |
| ۴۰ | مولوی سید قائم رضا نسیم امروہوی | ۱۹۴۸ء | ۱۹۵۲ء |
| ۴۱ | مولوی جود الغفار بریلوی | بعد ۱۹۵۲ء | تقریباً ۱۹۵۴ء |
| ۴۲ | اطہر علی الہ آبادی | ۱۹۵۴ء | تاحال مدرس ہیں، |
| ۴۳ | سرفراز احمد فیض آبادی | ۱۹۵۴ء | " " |
| ۴۴ | محمد عارف مجددی | ۱۹۵۴ء | " " " |
| ۴۵ | ابوذر مانی الہ آبادی | بعد ۱۹۵۴ء | تقریباً ۱۹۵۷ء |
| ۴۶ | نہال الدین احمد خیال | ۱۹۵۵ء | تاحال مدرس ہیں، |
| ۴۷ | محمد حنیف خاں | ۱۹۵۹ء | ۱۹۶۸ء |
| ۴۸ | سید حامد حسین | ۱۹۶۱ء | تاحال مدرس ہیں، |
| ۴۹ | حسن محمد عابدی امروہوی | ۱۹۶۱ء | " " " |
| ۵۰ | سلامت یار خاں | ۱۹۷۰ء | " " |
| ۵۱ | محبوب علی خاں | ۱۹۷۰ء | " " " |
| ۵۲ | قاری احمد حسن خاں | ۱۹۷۰ء | " " " |

### فہرست اساتذۂ حدیث

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱ | مولوی سید حسن شاہ | ۱۸۶۸ء | ۱۸۸۶ء |
| ۲ | مولوی سید محمد شاہ | ۱۸۸۲ء | ۱۸۹۰ء |



| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۳ | مولوی حافظ وزیر احمد | ۱۸۸۸ء | ۱۹۲۸ء |
| ۴ | مولوی منور علی | ۱۸۹۰ء | ۱۹۲۳ء |
| ۵ | مولوی جعفر علی خاں | ۱۸۹۴ء | ۱۹۰۷ء |
| ۶ | حافظ عبدالوہاب خاں محدث | ۱۹۲۴ء | ۱۹۲۶ء |
| ۷ | سید محمد یوسف | ۱۹۲۶ء | ۱۹۳۱ء |
| ۸ | مولوی سید احمد شاہ | ۱۹۳۱ء | ۱۹۴۶ء |
| ۹ | مولوی محمد حقیق افغانی | ۱۹۴۴ء | ۱۹۵۷ء |

### فہرست مدرسینِ ادب

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱ | مولوی محمد طیب مکی | ۱۸۸۶ء | ۱۸۹۳ء |
| ۲ | مولوی معین الدین | ۱۸۹۴ء | ۱۹۱۰ء |
| ۳ | مولوی نورالحسین مجددی | ۱۹۲۴ء | ۱۹۳۲ء |
| ۴ | مولانا وجیہ الدین احمد خاں قادری | ۱۹۳۶ء | ۱۹۵۷ء |

### فہرست مدرسینِ ریاضی

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱ | مولوی عبدالعلی خاں ریاضی داں | تقریباً ۱۸۵۰ء | ۱۸۸۵ء |
| ۲ | مولوی عبدالقیوم | ۱۸۹۰ء | — |
| ۳ | عطاء اللہ خاں | ۱۸۹۱ء | ۱۸۹۱ء |

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۴ | مولوی فضل الرحمٰن خاں | سنہ ۱۸۹۳ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک نام آیا ہے، | |
| ۵ | مولوی وحید اللہ خاں | سنہ ۱۸۹۵ء | سنہ ۱۸۹۹ء |
| ۶ | مولوی علی حسن | سنہ ۱۸۹۷ء سے سنہ ۱۸۹۹ء تک نام آیا ہے، | |
| ۷ | مولوی اصغر حسین | سنہ ۱۹۰۸ء میں نام آیا ہے، | |
| ۸ | مولوی جعفر حسین | سنہ ۱۹۰۹ء | سنہ ۱۹۲۳ء |
| ۹ | مولوی نیاز محمد خاں | سنہ ۱۹۲۷ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک نام آیا ہے، | |
| ۱۰ | مولوی بشیر محمد خاں ولایتی | سنہ ۱۹۴۵ء | تقریباً سنہ ۱۹۵۵ء، |

فہرست مدرسین انگریزی

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱ | ماسٹر مشہود حسین | سنہ ۱۹۲۷ء | سنہ ۱۹۳۲ء تک نام ملتا ہے، |
| ۲ | ماسٹر عبد الحئی | سنہ ۱۹۳۵ء میں نام آیا ہے، | |
| ۳ | ماسٹر ظہیر علی خاں | سنہ ۱۹۳۶ء | سنہ ۱۹۳۸ء تک نام ملتا ہے، |
| ۴ | ماسٹر شوکت حسین خاں | سنہ ۱۹۳۸ء سے سنہ ۱۹۴۳ء تک نام آیا ہے، (انچارج نائٹ اسکول بھی تھے) | |
| ۵ | ماسٹر سید اعجاز حسین | سنہ ۱۹۴۰ء | — |

فہرست مدرسین دینیات شیعہ

| نمبر شمار | نام | تقرر | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۱ | مولوی مظفر علی خان لکھنوی | سنہ ۱۹۰۸ء | سنہ ۱۹۰۹ء |
| ۲ | مولوی شیخ اعجاز حسین | سنہ ۱۹۱۰ء | سنہ ۱۹۱۲ء |



| نمبر شمار | نام | تقرری | سبکدوشی |
|---|---|---|---|
| ۳ | مولوی تاثیر حسین | سنہ ۱۹۱۲ء | بعد سنہ ۱۹۳۱ء |
| ۴ | سید محمود حسن | سنہ ۱۹۳۳ء | سنہ ۱۹۳۳ء (چند دن رہے) |
| ۵ | سید جعفر حسین | سنہ ۱۹۳۳ء | سنہ ۱۹۳۲ (کچھ دن رہے) |

حوالے:-

۱ سرراد ھاکرشنا یونیورسٹی ایجوکیشن رپورٹ ۲ تذکرہ علمائے فرنگی محل از مولوی عنایت اللہ، اشاعت العلوم پریس لکھنو مطبوعہ سنہ ۱۹۳۰ء ص ۱۳۹ ۳ یہ نصاب مولانا بحر العلوم کے والد ملا نظام الدین سہالوی نے مرتب کیا تھا، آج بھی یہ نصاب بیشتر دینی مدارس میں درس نظامی کے نام سے رائج ہے ۴ "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" از مولانا ابو الحسنات ندوی، معارف پریس اعظم گڈھ مطبوعہ سنہ ۱۹۳۶ء ص ۳۳ ۵ ماہنامہ تحفۂ حنفیہ پٹنہ، شمارہ محرم وصفر سنہ ۱۳۲۶ھ ص ۳۵ ۶ بقول مولانا عبد السلام خاں صاحب، سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور، ۷ اخبار الصنادید جلد اول، از نجم الغنی خاں، نولکشور پریس لکھنو مطبوعہ سنہ ۱۹۱۸ء ص ۵۶۰ ۸ رپورٹ انتظامیہ ریاست رام پور بابتہ سنہ ۱۸۸۹-۱۸۸۸ء ص ۲۸۷ ۹ سوانح مولانا عبد القادر رائے پوری از مولانا ابو الحسن علی ندوی، نظامی پریس لکھنو مطبوعہ سنہ ۱۴۰۳ھ ص ۶۴ ۱۰ رام پور گزٹ جلد ۲، شمارہ ۳، مورخہ ۲۰ جنوری سنہ ۱۸۹۰ء ۱۱ بقول مولانا عبد السلام خاں صاحب ۱۲ ارشادات عالیہ جلد از نانا جان مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب (م سنہ ۱۹۸۷ء) قلمی مملوکہ شعائر اللہ خاں ۱۳ جامع مسجد رام پور از شعائر اللہ خاں مشمولہ ضیاء وجیہ، رام پور شمارہ سنہ ۱۹۸۱ء ص ۷۶، ۱۴ حالات مشائخ، مرتبہ سردار شاہ خاں وجیہی مکتبہ وزیریہ رامپور مطبوعہ سنہ ۱۹۸۳ء ص ۱۹۲، ۱۵ رام پور گزٹ جلد ۲۱، شمارہ ۶، مورخہ ۸ رفروری سنہ ۱۹۰۹ء ۱۶ رام پور گزٹ جلد ۲۴، شمارہ ۲۳، مورخہ ۳ رجون سنہ ۱۹۱۲ء، ۱۷ گزٹ رام پور اسٹیٹ جلد ۶۲ شمارہ ۲۲

مورخہ ۷ ارمئی ۱۹۴۹ء، ۱۸؎ ہفتہ وار دبدبۂ سکندری رام پور جلد ۸۷ شمارہ ۲۷ مورخہ ۲۲ راگست ۱۹۴۹ء ص ۷، ۱۹؎ بقول مولانا عبدالسلام خاں صاحب، ۲۰؎ شفیق الرحمٰن رام پوری از حکیم محمد حسین خاں شفا مشمولہ ماہنامہ آجکل دہلی، ماہ اگست ۱۹۷۹ء ص ۳۷، ۲۱؎ رپورٹ انتظامیہ ۱۸۸۸-۹ء ص ۱۲۸۷، ۲۲؎ نصاب مستقل مدرسہ عالیہ رام پور قسط اول مطبوعہ ۱۹۴۵ء ص ۷، ۲۳؎ شادان بلگرامی از مقبول احمد خاں وفا رام پوری، مشمولہ ماہنامہ پرستار کراچی، ماہ نومبر ۱۹۷۶ء ص ۱۷، ۲۴؎ بقول مولانا عبدالسلام خاں صاحب، ۲۵؎ رام پور گزٹ جلد ۲۰ شمارہ ۷، مورخہ ۲۴ رفروری ۱۹۰۸ء، ۲۶؎ نصاب مستقل مدرسہ عالیہ رام پور مطبوعہ ۱۹۴۵ء، ۲۷؎ یہ نصاب ۱۹۰۶ء میں ناظم پریس رام پور سے (صفحات ۲۷) شائع ہوا، اس کی واحد کاپی رضا لائبریری رام پور میں دستیاب ہے، اس کی ایک قلمی نقل میرے پاس بھی محفوظ ہے، ۲۸؎ اخبار الصنادید جلد دوم ص ۱۸۹، ۲۹؎ رام پور کے اوقاف از عبدالسلام خاں رام پوری (قلمی عکسی مملوکہ شفاعت اللہ خاں) ۳۰؎ مدرسہ عالیہ رام پور از کلب علی خاں فائق رام پوری مشمولہ علمی ادارے نمبر (میگزین علم و آگہی کراچی) مطبوعہ ۱۹۷۵ء ص ۳۱، ۳۱؎ حالات دیہی موضع وار تحصیل شاہ آباد ریاست رام پور، سرکاری پریس رام پور، مطبوعہ ۱۹۰۴ء ص ۴۴،

**نوٹ:۔** فارس سازی میں رام پور اسٹیٹ گزٹ کے شماروں سے مدد لی گئی ہے، اس کے علاوہ دیگر ذرائع مثلاً سرِ رشتہ بکس، سول لسٹ، مدرسہ عالیہ کے رجسٹر، اخبار دبدبۂ سکندری رام پور، تذکرۂ کاملان رام پور، انتخاب یادگار، حقیقت رام پور وغیرہ بھی معاون ثابت ہوئے ہیں،

مذکورہ ذرائع کے علاوہ بہت سے موقر اشخاص نے بھی میرے اس کام کی تکمیل میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا، میں ان حضرات کا فرداً فرداً انتہائی متشکر اور احسان مند ہوں، اللہ تعالیٰ انھیں اس کی جزا دارین میں عطا فرمائے، (آمین)

---



# سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی وفات پر تعزیتی خطوط

اتر پردیش اردو اکیڈمی ۲۲/۱۱/۱۹۸۷ء

محترمی! سلام مسنون

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ گفتگو کا آغاز کس عنوان سے کروں، سید صباح الدین صاحب کی وفات کا غم آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا، آپ لوگوں پر جو گذری ہوگی اس کا تھوڑا بہت احساس کرسکتا ہوں،

میں چاہتا ہوں کہ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے "خبرنامہ" کا فوری طور پر ایک ضمیمہ شایع کیا جائے، آج میں نے سکریٹری کو ٹیلی فون سے اپنے ارادے سے مطلع کردیا، اور اس سلسلہ میں ضروری کارروائی کے لیے کہہ دیا ہے۔

پہلا کام ہے مواد کی فراہمی، ڈاکٹر ریاض الدین کو آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، اگر آپ ضروری مواد فراہم کردیں تو اسی نومبر میں ضمیمہ شایع ہوجائے گا۔

اگر آپ ایک مختصر تاثراتی مضمون لکھ دیں تو اور بھی آسانی ہوجائے، میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ:

(۱) آپ مرحوم کے سوانحی حالات پر مشتمل کسی سے ایک مختصر مضمون لکھوادیں، یا

سوانحی خاکہ فراہم کردیں تو میں یہاں اسے مضمون کی شکل دے دوں گا۔

(۲) مرحوم کے بارے میں دارالمصنفین کے بعض رفقاء کے مختصر تاثرات قلم بند ہوجائیں۔

(۳) آپ خبرنامہ کے لیے جس مواد کو مناسب سمجھتے ہوں اس کی بھی نشاندہی کردیجیے۔

"خبرنامہ" ۱۶ صفحات پر مشتمل ہوگا اور اسے ۲۸ نومبر کو شایع کیا جائے گا، اسی دن شام کو اکادمی میں تعزیتی جلسہ بھی ہوگا، میں ان شاء اللہ ۲۷ کو لکھنؤ پہونچ جاؤں گا۔

باقی حالات بدستور، حسب مراتب سلام و دعا۔ والسلام

امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔ محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی

وچیرمین اترپردیش اردو اکادمی

---

۱۵/۱۲/۸۷ء

محترم ومکرم جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ معارف میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے سانحۂ انتقال کی اطلاع پڑھتے ہی ایک سکتہ کا عالم طاری ہوا، گویا اپنے ہی کنبہ کا کوئی شفیق ومحترم بزرگ اچانک اٹھ کر روپوش ہوگیا، حالانکہ بالمشافہہ ملاقات سے محروم رہا، یقیناً ان کے انتقال سے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کا ایک اہم ترین ستون گر گیا ہے۔

وما کان قیس ہلکہ ہلک واحد ÷ ولکنہ بنیان قوم تہدما

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ برصغیر بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو ابھی کن کن آزمائشوں کا سامنا کرنا ہوگا، مرحوم نہ صرف تاریخ اور ادب کے بلند پایہ محقق اور مصنف تھے، بلکہ برصغیر کی ان نامور اور ممتاز شخصیتوں میں سے بھی تھے جنھوں نے تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اسلامی



نشوونما کی بنیادیں استوار کرنے میں قابل قدر خدمات انجام دیں، اللہ انھیں جنت الفردوس نصیب کرے، اور ان کی قبر پر مغفرت کے پھول برسائے، اور مسلمانوں کو اپنی سخت آزمائشوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ دارالمصنفین کو اس وقت پروفیسر خلیق احمد نظامی کی خدمات حاصل کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

سید صاحبؒ کے انتقال سے آپ کو اور آپ کے رفقاء کو جو صدمہ پہونچا ہوگا، میں اپنے تمام منتسبین کے ساتھ اس میں آپ کا برابر کا شریک ہوں۔

دلفگار محمد فاروق بخاری

عیدگاہ، سری نگر، کشمیر

---

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند، دہلی ۳۱/۱۱/۸۸ء

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی! کل شام دارالمصنفین کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمنؒ کے ایک حادثہ میں جاں بحق ہونے کی خبر پرملال بجلی بن کر گری انا للہ وانا الیہ راجعون

موصوف کی وفات علمی، فکری، تحقیقی اور صحافتی دنیا کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے، اور اسلامیان ہند کے لیے غیر معمولی نقصان ہے، یہ صرف ادارہ کا ہی نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ ہند کا نقصان ہے، مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند اس سانحہ پر آپ کے غم میں برابر کی شریک و مغموم ہے، ہم مرحوم کے لیے مغفرت و رضوان، پسماندگان کیلئے صبر وتحمل اور ادارہ میں نعم البدل کے لیے دعاگو ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں لے لے۔ آمین، والسلام۔

شریک غم عبدالوہاب خلجی قائم مقام ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند۔

شعبۂ اردو سیفیہ کالج۔ بھوپال

محترمی و مکرمی اصلاحی صاحب! تسلیم

اخبار میں رحمان بھائی کے انتقال کی مختصر خبر پڑھی تو مت پوچھیے کیسی بجلی گری، دل چور چور ہوگیا، نمناک آنکھوں اور غمناک دل کے ساتھ جب گھر والوں کو یہ خبر سنائی تو سب غم کی تصویر بن گئے،

تفصیل معلوم نہ ہوسکی، حادثہ کیسے ہوا اس کا پتہ بھی نہ چل سکا کس سے پوچھیں، کہاں سے معلوم کریں، بس گھٹ کر رہ گئے، ابھی چند ہفتہ پہلے ان کا خط آیا تھا، لکھا تھا کہ اب دارالمصنفین میں علامہ سید سلیمان ندویؒ سے متعلق پروقار پروگرام ہوں گے، سید صاحبؒ سے متعلق کتابیں چھپنے جارہی تھیں اس سے بھی آگاہ کیا تھا، لیکن اچانک ان کے چلے جانے سے محفل سونی ہوگئی اور دارالمصنفین پر اداسی چھاگئی، ہم جیسے دور دراز میں رہنے والے دارالمصنفین کے شیدائی ٹوٹ سے گئے، موت تو برحق ہے، وہ تو آتی ہے، اسے آنا چاہیے، اس کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوسکتی، لیکن اس طرح کہ لوگ حیران رہ جائیں، عزیز واقارب بے بس ہوجائیں، سیل غم اپنے ساتھ سب کچھ بہالے جائے، اللہ رحم فرمائے، اور ہم سبھوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔

غم زدہ: عبدالقوی دسنوی

---

گلفشاں، قاضی پور خورد، گورکھپور

۲۸ر نومبر ۱۹۸۷ء

محترمی! سلام مسنون۔ دس پندرہ روز سے میں باہر تھا، اخبار سے محترم سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے انتقال کی اطلاع ملی جس حادثہ سے مرحوم کو دوچار ہونا پڑا تھا اسے سوچ کر سخت ذہنی اذیت ہوئی، میں تعزیت کے لیے اعظم گڑھ آنے والا تھا لیکن سفر سے واپسی کے بعد طبیعت خراب ہوگئی اور ابھی تک ٹھیک نہیں ہوں، مرحوم سے میرے



گہرے تعلقات تھے، عمر میں وہ مجھ سے کافی بڑے تھے، لیکن میری بے تکلفی کا برا نہیں مانتے تھے، یہ ان کی شفقت اور محبت تھی، اب ایسی خوبیوں والے لوگ کہاں ملتے ہیں، انھوں نے جو علمی، ادبی اور مذہبی سرمایہ چھوڑا ہے، وہ ہمیشہ طالبین وشائقین کو فیض پہونچاتا رہے گا، اور اللہ ان کو اجر دے گا، دور حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے جو طرح طرح کے فتنے اٹھائے گئے ہیں، اور بہت سے مسائل پیدا کر دیے گئے ہیں، ان کا حل اور فتنوں کا سدباب اپنی عالمانہ اور محققانہ تحریروں کے ذریعہ کرنے کی مولانا مرحوم نے حتی الوسع کوشش کی ہے، یہ ان کا بہت بڑا احسان قوم وملت پر ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ان کے محاسن کا اجر عطا کرے، میری طرف سے ان کے گھر والوں اور دارالمصنفین کے گھرانے کے سب لوگوں سے تعزیت کردیں، والسلام

شریک غم: محمد حامد علی

---

دفتر تہذیب الاخلاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۹ر نومبر ۱۹۸۷ء

ضیاء الدین صاحب! سلام مسنون۔ قومی آواز سے صباح الدین صاحب کے سانحۂ ارتحال کا علم ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حادثہ اتنا غیر متوقع ہے کہ کچھ لکھا نہیں جارہا ہے، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور مرحوم کے درجات کو بلند کرے، آمین، والسلام

کبیر احمد جائسی

---

گرلا، بمبئی۔

یکم دسمبر ۱۹۸۷ء

محترمی ضیاء الدین صاحب! سلام مسنون۔ محترمی صباح الدین صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر لکھنؤ کے اخبار "عزائم" اور دہلی کے خطوط سے ہوئی، اس سانحۂ عظیم سے

دل دہل گیا، اور آنکھیں اشکبار ہوگئیں، آپ لوگوں پر کیا گذر گئی ہوگی، آپ لوگوں نے ان کو خیریت سے لکھنؤ کے لیے رخصت کیا ہوگا اور واپسی کا انتظار کر رہے ہوں گے کہ اچانک یہ خبر پہونچی ہوگی، صباح الدین صاحب کی موت تو ذاتی غم ہے ہی ملک و ملت کا بھی غم ہے، انھوں نے اپنی تصانیف سے قوم و ملت کے درد کا درماں بھی پیش کیا، اور زخم کا مرہم بھی، شبلی کے جس درخت کی سید سلیمانؒ نے نگرانی کی، اور شاہ معین الدین مرحوم جس کو آگے بڑھایا، صباح الدین صاحب نے ان دونوں کی روایات کو زندہ و تابندہ رکھا اور اسے آگے بڑھایا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ دارالمصنفین کو مالی طور پر مستحکم کرنے کا ہے، ان کے دور میں تصانیف کی تعداد بڑھی اور دارالمصنفین سے متعلق عام حلقوں میں واقفیت کا اضافہ ہوا، دارالمصنفین پہلے طبقۂ خواص تک محدود تھا، اب اسے عوامی حیثیت حاصل ہوگئی، ان کی ذات سے دارالمصنفین بیرونی ممالک میں روشناس ہوا اور اس کے وقار میں اضافہ ہوا۔

شاہ صاحب مرحوم کے بعد یہ اطمینان تھا کہ صباح الدین صاحب موجود ہیں وہ دارالمصنفین کی ساکھ کو قائم رکھ سکیں گے، جو انھوں نے کر دکھایا، وہ رزم و بزم دونوں کے آدمی تھے، اب یہ ذمہ داری بظاہر آپ پر آپڑی ہے، آپ ایک شریف انسان ہیں، لیکن اس دور میں شریف انسان ہونا کافی نہیں ہے، آپ شعبۂ علمی تو دیکھ لیں گے، لیکن شعبۂ انتظامی کون دیکھے گا؟ مستقبل کا دارالمصنفین کیا ہوگا، اس پر چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں، میں چونکہ خود دارالمصنفین کا پرستار ہوں، اس لیے یہ سوال بار بار میرے ذہن میں بھی آرہا ہے، خدا بڑا مسبب الاسباب ہے، وہ کوئی نہ کوئی انتظام کرے گا ہی، لیکن صباح الدین صاحب کے انتقال کی تلافی کیسے ہوگی، اور ان کے اٹھ جانے سے جو خلا ہوا ہے وہ کیسے پُر ہوگا، ابھی تو آپ لوگ خود پریشانی میں مبتلا ہوں گے، جب اس میں کمی آئے تو مجھے چند سطروں سے نوازیے گا، اس ماہ کا معارف اگر ہو سکے تو مجھے ضرور ارسال



کر دیجیے گا،

خوشیہ تو غالباً اعظم گڈھ پہونچ گئی ہوں، میں ان شاء اللہ ماہ مئی میں آؤں گا، تعزیت کا ایک خط بیگم صباح الدین صاحب کو بھی لکھا ہے، ان لوگوں کے لیے بھی غم ہے، کیا گذر گئی ہوگی ان لوگوں پر، خدا سب کو صبر عطا فرمائے۔ آمین۔

تجہیز و تکفین تو غالباً مسجد کے سامنے ہی ہوئی ہوگی، سب تفصیل لکھیے گا، دارالمصنفین کے موجودہ رفقاء سے بھی میری طرف سے اظہار تعزیت کیجیے، دوسری طرف کا خط مولوی عبد الباری صاحب کو دے دیجیے۔

آپ کا شریک غم: خورشید نعمانی

---

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ — ۲۵ نومبر ۸۷ء

محترمی جناب منیجر صاحب! سلام مسنون

چند دن پہلے یہاں ہم لوگوں کو اخبار آزاد ہند کے ذریعہ یہ خبر ملی کہ مولانا صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا ایک کار کے حادثہ میں انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ خبر سن کر ہمارے ادارہ کے تمام متعلقہ اشخاص کو نہایت ہی صدمہ ہوا، بس یوں سمجھیے کہ ہندوستان کے علمی و ادبی، مذہبی و تاریخی آسمان کا ایک اور ستارہ ٹوٹ گیا، اور اسلامی دنیا کا ایک گوہر نایاب گم ہوگیا، موصوف کی تعریف کرنا تو گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے، مگر تردد یہی ہے کہ اس قحط الرجال کے زمانہ میں ان کی جگہ کو پُر کرنا بڑا مشکل ہے،

ہماری ایشیاٹک سوسائٹی "معارف" کی مستقل خریدار ہے، اور ان کے شذرات کو پڑھنے کا ہم لوگ بڑی بے چینی سے انتظار کرتے تھے، آہ! اب وہ رواں قلم خاموش ہوگیا، ہم لوگوں کا

دل ان کے لیے روتا ہے، موصوف سال ڈیڑھ سال قبل ہمارے یہاں آئے تھے، اور ان کی
مشفقانہ و عالمانہ باتوں سے ہم سب لوگ بہت ہی محظوظ ہوئے تھے، دعا ہے اللہ ان کو اپنے
جوار رحمت میں جگہ دے، اور ان کے درجات کو بلند فرمائے، آمین۔ ان کے متعلقین کو ہم لوگوں
کی طرف سے بھی صبر کی تلقین کر دیں، اللہ آپ حضرات کو بھی صبر جمیل عطا کرے، اور ادارہ دارالمصنفین
کو نعم البدل عطا کر دے، تاکہ وہ اسی شان سے علمی و دینی خدمت انجام دیتا رہے۔ آمین۔

مرحوم کے لیے ہم لوگوں کی یہی دعا ہے کہ بقول اقبال

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

والسلام عبدالخالق ندوی اسسٹنٹ لائبریرین

---

دارالعلوم الاسلامیہ۔ بستی ۲۵ر نومبر ۸۷ء

محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خدا کرے آنجناب کے مزاج گرامی بخیر ہوں۔

محترم سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی اچانک وفات حسرت آیات کی خبر دل پر بجلی
بن کر گری، ان کی موت سے علم و ادب، تاریخ و تحقیق کا ایک مضبوط ستون گر گیا، بلاشبہ مرحوم علامہ
سید سلیمان ندوی کے علمی جانشین تھے، اور برصغیر کی علمی، ادبی اور تحقیقی انجمنوں کے صدر نشین تھے،
اس وقت وہ قومی، اسلامی تاریخ کے باب میں ایک سند تھے۔

عالم اسلام کی مایۂ ناز شخصیات بھی سید صاحب مرحوم کے فضل و کمال کی معترف تھیں
ان کے اچانک انتقال سے ادارہ دارالمصنفین یتیم سا ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت



فرمائے، اور جوار رحمت میں جگہ دے، نیز پسماندگان کو صبر جمیل اور دارالمصنفین کو ان کا نعم البدل
عطا فرمائے۔ محمد باقر حسین

صدر دارالعلوم الاسلامیہ بستی

---

"دارالادب" مہادیوا محلہ، آرہ، بہار۔ ۹ر دسمبر ۸۷ء

محترمی تسلیم، محترم سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کے سانحہ ارتحال کی
خبر اخبار میں پڑھی، بے حد رنج و غم ہوا، میں ان کی تحریریں نہایت شوق سے پڑھا کرتا تھا، وہ صاحب علم
تھے، اور علم کے قدردان بھی، ایک عالِم کی موت ایک عالَم کی موت ہے، خدا مرحوم کو جنت الفردوس
میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین ثم آمین۔

میں آپ لوگوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ تاج پیامی

---

محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب رکن دینی تعلیمی کونسل کے اچانک سانحۂ ارتحال
کی خبر سن کر ذمہ داران دینی تعلیمی کونسل کو سخت دھچکا لگا، موصوف کی وفات کی خبر سن کر یقین ہی
نہیں آرہا تھا، مگر کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کے مطابق موت یقینی ہے۔

موصوف کے اچانک سانحۂ ارتحال پر دفتر دینی تعلیمی کونسل میں جناب حبیب اللہ اعظمی
صاحب آفس سپرنٹنڈنٹ کی زیر صدارت تعزیتی میٹنگ ہوئی، جس میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش
کیا گیا، دفتر دینی تعلیمی کونسل کا عملہ ان کی وفات پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے، اور دعا ہے

کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین۔

بسم اللہ　آفس سپرنٹنڈنٹ

بھوپال

۲۲/۱۱/۸۷ء

مکرم جناب مولانا ضیاء الدین صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔　امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

پرسوں بھوپال کے "روزنامہ افکار" سے مرحوم جناب صباح الدین صاحب کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ملی، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، بڑی بے تابی ہے، تفصیل نہیں معلوم ہوسکی، کسی خادم کے ذریعہ تفصیلات تحریر کرادیں، کہ خدانخواستہ اور کوئی توان کے ساتھ نہ تھا، تجہیز و تکفین کہاں ہوئی، آپ کے یہاں کا نظام وقتی طور پر کیا ہوا، بہرحال آپ ہمیشہ ان کے مخلص مشیر ومعاون رہے اب آپ کو ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر تمام کاموں کو سنبھالنا ہے۔

یہاں بھوپال میں بہت غم منایا گیا، دارالعلوم میں فوراً تعزیتی جلسہ ہوا، اور قرآن پاک ختم کیا گیا، اور دعا کی گئی کہ خدا تعالیٰ مرحوم کو جنت نصیب کرے، اور آپ کو ان کا صحیح اور مکمل جانشین بنادے۔

مہربانی فرماکر میری طرف سے اور والدہ محترمہ کی طرف سے ان کے گھر بھی تعزیت کہلوا دیجیے گا۔

تفصیلات کا انتظار رہے گا، ویسے میرا ارادہ خود حاضر ہوکر تعزیت کرنے کا تھا، لیکن فی الحال یونیورسٹی میں چھٹی کا مسئلہ ہے، والسلام۔

طالب دعا: حسان - لکچر شعبۂ عربی بھوپال یونیورسٹی



# مطبوعات جدیدہ

**اسلامی تربیت:** مرتبہ مولوی عبد الوہاب حجازی صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۴۹، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب، بنارس

اس کتاب میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے ضروری اور اہم مسائل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے جو تین فصلوں میں منقسم ہے، مصنف نے بچوں کی زندگی کے تین مراحل کے متعلق اسلام کے اصول تربیت بیان کیے ہیں، پہلی فصل میں مدرسہ میں داخلہ سے پہلے یعنی ولادت سے پانچ سال تک کی عمر کے بچوں کے بارے میں اسلامی ہدایات پیش کی گئی ہیں، دوسری میں چھ سے چودہ برس تک کی عمر کے بچوں کے لیے آداب تربیت بیان کیے گئے ہیں، اور تیسری فصل میں پندرہ سے پچیس برس تک کی عمر والوں کے لیے اسلام کے نظام تربیت کی وضاحت کی گئی ہے، ہر بحث کی وضاحت کے لیے آیات و احادیث نبویؐ بھی نقل کی گئی ہیں، اور اسوۂ نبویؐ اور ائمہ اسلام کے اقوال بھی دیے گئے ہیں، مگر مصنف نے تربیت کا دائرہ بہت وسیع کردیا ہے اور تربیت کے عملی مسائل سے کم تعرض کیا ہے، اس کی وجہ سے ممکن ہے بعض امور غیر متعلق سمجھے جائیں، اس طرح یہ کتاب اسلام کی اخلاقی و معاشرتی تعلیم کا خلاصہ ہے، شروع میں مولانا مقتدیٰ حسن ازہری کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، اس میں تربیت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، اس کی ضرورت و اہمیت اور اسے نظر انداز کرنے کے نقصانات بتائے ہیں، اور اس بارے میں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کا امتیاز دکھایا ہے، اور یہ واضح کیا ہے کہ اس نے تربیت کے لیے کن امور کی جانب توجہ دلائی ہے اور اس کے حصول کے کیا وسائل و ذرائع اختیار کیے ہیں۔

**متاعِ فکر و نظر**: مرتبہ جناب محمد آفاق صدیقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۵۲، مجلد قیمت ۳۰ روپیے، پتہ: آفاق نشان منزل ۴۳ / غفار منزل، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

جناب آفاق احمد صدیقی کا اصل مشغلہ درس و تدریس ہے، اب انھوں نے اپنی "متاعِ فکر و نظر" لٹانے کے لیے تصنیف کے میدان میں قدم رکھا ہے، یہ متاعِ فکر و نظر، نثر و نظم دونوں کا مجموعہ ہے، اور اس میں زندگی کی موجودہ ناہمواری و بے راہ روی، فکر و عمل کے تضاد و انتشار اور انسان کی سنگ دلی و بربریت اور اس کے فریب و طمع کاری وغیرہ کی تصویر کشی کی گئی ہے اکثر مضامین میں ظرافت و مزاح کا رنگ شوخ ہے، مگر ناگوار نہیں ہے، پہلے مضمون "شب جائے کہ من بودم" میں ایک سیمینار کے مقالہ نگاروں کا دلچسپ خاکہ کھینچا ہے، اس سے اور دوسرے مضامین سے ان کے مشاہدہ کی گہرائی اور نگاہ کی وسعت و دوربینی کا پتہ چلتا ہے، ایک مضمون "رامائن" سنجیدہ طرز کا ہے، اس میں بحیثیت مثنوی اس کا جائزہ لیا ہے، اور اس کی اہمیت، نوعیت، خصوصیت اور تاریخی پس منظر بیان کرکے اس کے بنیادی محرکات واضح کیے ہیں، ان کے خیال میں یہ محض کہانی نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ ایک فرد اپنی کھوئی ہوئی عظمت انسانی کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، صدیقی صاحب کی زندگی بڑی تلخیوں اور پیچیدگیوں میں گذری ہے، اس لیے ان میں بڑی خود اعتمادی و خودداری ہے، جو ان کی تحریر سے بھی نمایاں ہے۔

**ترکی پاک و ہند کی تحریروں میں**: مرتبہ حکیم محمد سعید صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۰۸، قیمت ۳۵ روپیے، پتہ: ہمدرد یونیورسٹی پریس، کراچی ۱۸۔



حکیم محمد سعید دہلوی ایک ماہر و حاذق طبیب بھی ہیں، اور اچھے مصنف و اہل قلم بھی ہیں، انھوں نے اس مختصر کتاب میں ترکی اور وہاں کے اشخاص و مسائل کے بارہ میں ہند و پاک میں اردو اور انگریزی میں جو کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں ان کا انڈکس شایع کیا ہے، مضامین جن اخباروں اور رسالوں میں چھپے ہیں ان کے اور مضمون نگاروں کے نام بھی لکھے ہیں، اور اشاعت کی تاریخ، مہینہ اور سال کی صراحت بھی کی ہے، اسی طرح کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام اور مطبع اور سنۂ طباعت کا بھی ذکر کیا ہے، اردو اور انگریزی کے دیباچہ میں پاکستان اور ترکی کے موجودہ تعلقات، دولت عثمانیہ کے زوال اور خلافت کے خاتمہ پر ہندوستان کے مسلمانوں کے اضطراب اور تحریک خلافت کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے، گو اس میں ترکی کے سارے لٹریچر کا مکمل احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے، اور اس میں کہیں کہیں فروگذاشتیں بھی ہیں، تاہم اس سے ترکی پر تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

**ہندوستان اور نظام قضا**۔ مرتبہ مولانا عتیق احمد بستوی، استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۸۰، قیمت ۵ روپے پتے:۔ (۱) مکتبہ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، پھلواری، پٹنہ (۲) مکتبہ مجلس صحافت و نشریات، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، ندوہ، لکھنؤ۔

اس رسالہ میں اسلامی و غیر اسلامی ملکوں کے لیے نظام قضا کو ضروری و لازمی بتایا گیا ہے، پہلے ہندوستان میں عہد بعہد مسلمانوں کے نظام قضا کی مختصر تاریخ بیان کی ہے، پھر آزادی کے بعد کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے، جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلمانوں کو معاشرتی اصلاح کے لیے وسیع، منظم اور ہمہ گیر جد و جہد کی دعوت دی ہے، اسی کے ضمن میں سارے ملک میں دار القضاء قائم کرنا اور اسلامی عدالتوں کا جال بچھانا مسلمانوں کا دینی و

اجتماعی فریضہ بتایا ہے، مصنف نے نصب قاضی کا شرعی حکم، قضا کی حقیقت اور اس کے انعقاد کے شرعی طریقوں پر فقہی تصریحات کی روشنی میں مدلل بحث کی ہے، اور واضح کیا ہے کہ نصب قاضی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، آخر میں ہندوستان میں نظام قضا کا طریقہ کار بتایا گیا ہے، یہ رسالہ فقہی معلومات کے علاوہ اس حیثیت سے بھی مفید اور اہم ہے کہ اس میں وقت کے ایک ضروری مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

**رشحات قیصری**: مرتبہ جناب مسعود انور علوی کاکوروی صاحب، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۰ روپیے پتہ:۔ کتب خانہ انوریہ، تکیہ شریفہ کاظمیہ، کاکوری، ضلع لکھنؤ۔

مولوی محمد عالم صاحب قیصری (متوفی ۱۳۵۰ھ) کاکوری کے علمی و صوفی مشرب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے عمر بھی کم پائی اور بقول مرتب ان کی استعداد بھی اچھی نہ تھی مگر اپنے ماموں کی توجہ اور فیض تربیت سے خوب چمکے، انھوں نے موزوں طبیعت پائی تھی اور اردو و فارسی دونوں میں مشق سخن فرماتے تھے، مگر ابھی تک کلام کی طبع و اشاعت کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لیے مسعود انور علوی کاکوروی صاحب نے ان کے اردو کلام کا یہ انتخاب شائع کیا ہے، جو غزلیات پر مشتمل ہے، قیصری صاحب کا رنگ قدیم ہے، مگر کلام عشق کے جوش و مستی اور رنگینی و شوخی سے معمور ہے، مرتب نے مقدمہ میں ان کی شاعرانہ خصوصیات تفصیل سے بیان کی ہیں، اور ان کے حالات بھی عقیدت سے لکھے ہیں۔

**نکاح و طلاق** مرتبہ سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۶، قیمت دو روپے پتہ مکتبہ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، پھلواری شریف پٹنہ۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اردو اور ہندی میں یہ مفید کتابچہ شائع کیا ہے جو نکاح و طلاق سے متعلق بنیادی اور ضروری باتوں پر مشتمل ہے۔

"ض"

---

جلد ۱۴۱ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۸ء عدد ۵

## مضامین



## مقالات



## باب التقریظ والانتقاد



---